سیندور کی سوگندھ

(ناول)

دیپک بُدکی

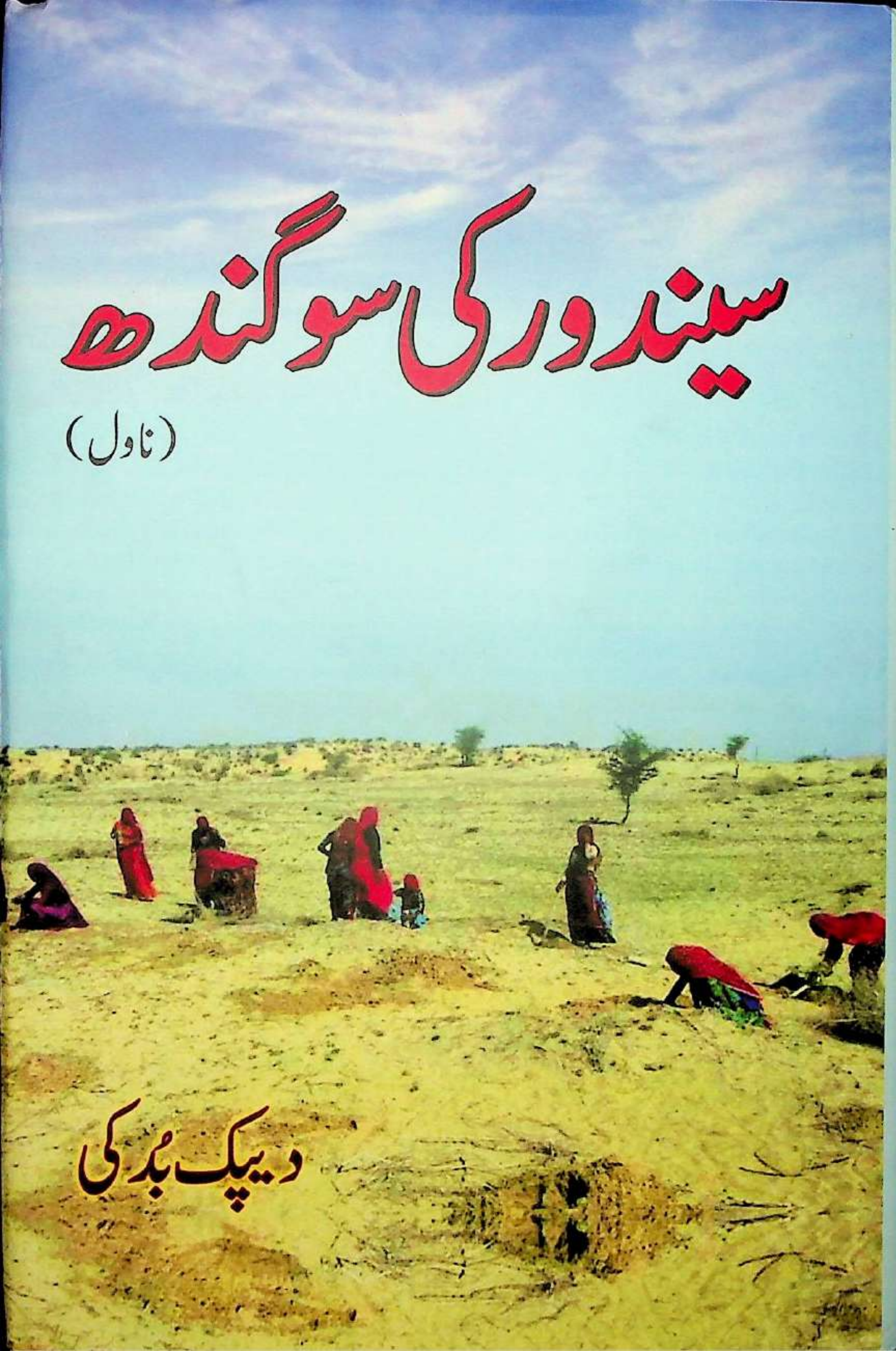
سیندور کی سوگندھ
(ناول)
دیپک بدکی

دیپک بُدکی

سیندور کی سوگندھ

(ناول)

مصنف کی تصانیف

☆ افسانوں/افسانچوں کے مجموعے:

۱)ادھورے چہرے (ایڈیشن سوم ۲۰۱۴، ہندی ۲۰۰۵ء)
۲)چنار کے پنجے (ایڈیشن دوم ۱۴ء، ہندی ۱۱ء)
۳)زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی (ایڈیشن دوم ۲۰۱۸ء)
۴)ریزہ ریزہ حیات (۲۰۱۱ء)
۵)روح کا کرب (۲۰۱۵ء)
۶)مٹھی بھر ریت [افسانچے] (۲۰۱۵ء)
۷)اب میں وہاں نہیں رہتا (۲۰۱۷ء)
۸)جڑوں کی تلاش (۲۰۱۹ء)
۹)یہ کیسا رشتہ! [افسانچے] (۲۰۲۱ء)
۱۰)پتّوں پر لکھی تحریریں (۲۰۲۳ء)
۱۱)اپنا اپنا سچ (ایڈیشن دوم ۲۰۲۴ء)

☆ناول:

۱۲)آزادی (۲۰۲۲ء)
۱۳)سیندور کی سوگندھ (۲۰۲۵ء)
۱۴)لوحِ حیات (۲۰۱۸ء)

☆خود نوشت سوانحعمری:

☆ تنقید و تبصرے:

۱۵) عصری تحریریں (۲۰۰۶ء)
۱۶) عصری شعور (۲۰۰۸ء)
۱۷) عصری تقاضے (۲۰۱۳ء)
۱۸) عصری تناظر (۲۰۱۸ء)
۱۹) عصری نقوش (۲۰۱۹ء)
۲۰) ادبی مباحث (۲۰۱۹ء)
۲۱) جموں و کشمیر کا عصری ادب (۲۰۱۹ء)
۲۲) عصری زاویے (۲۰۲۰ء)
۲۳)عصری رجحانات (۲۰۲۲ء)
۲۴) عصری تخلیقات (۲۰۲۲ء)

☆ تحقیق:

۲۵) اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار (ایڈیشن دوم ۲۰ء)
۲۶) کرشن چندر۔میری نظر میں (۲۰۲۱ء)

÷ملنے کا پتہ÷

(۱) میزان پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، بٹہ مالو، سرینگر، کشمیر۔۱۹۰۰۰۹
(۲) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۳۱۹۱، وکیل اسٹریٹ، کوچہ پنڈت، لال کنواں دہلی۔۱۱۰۰۰۶
(۳)ایم آر پبلی کیشنز، ۱۰ میٹرو پول مارکیٹ، ۲۵-۲۴-۲۷، پہلی منزل کوچہ چیلاں، دریا گنج، دہلی۔۱۱۰۰۰۲

سیندور کی سوگندھ

(ناول)

دیپک بُدکی

ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی

©جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

کتاب : سیندور کی سوگندھ (ناول)

مصنف : دیپک بُدکی

مطبع : ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی۔

پیش کش : عبدالصمد دہلوی

ناشر : ایم۔آر۔پبلی کیشنز

10 میٹرو پول مارکیٹ، 2724-25 کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی

SINDOOR KI SAUGANDH (Novel)

by: **Deepak Budki**

102-A, S. G. Impression, Sector 4-B, Vasundra, Ghaziabad-201012

Cell" 9868271199 Email: deepak.budki@gmail.com

ISBN: 978-93-6058-558-7

First Edition : 2025

Price: Inland:` 250/- Foreign : $ 5

Library Edition: ` 395/-

Printed & Published by

M. R. Publications

Printers, Publishers, Book Sellers & Distributors of Literary Books

10 Metropole Market, 2724-25 First Floor

Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002

Cell: 9810784549 (Whatsapp), 9873156910

E-mail: abdus26@hotmail.com

انتساب

عالی ہمت اور اولوالعزم عورتوں

کے نام

تحریر ظہری

اس ناول کے سبھی کردار، مقامات اور واقعات فرضی ہیں۔ کسی شخص، مقام یا واقعہ سے کوئی مناسبت محض اتفاق ہوسکتا ہے جس کے لیے مصنف یا ناشر پر کوئی ذمّے داری عاید نہیں ہو گی۔

÷÷÷÷÷

اس کتاب کو یا اس کے کسی بھی حصے کو مصنف کی اجازت کے بغیر (ماسوائے تحقیقی و تنقیدی کاموں کے) شائع کرنا قانوناً جرم ہے۔ خلاف ورزی کرنے والے پر قانونی کارروائی کی جائے گی۔

پیش لفظ

'سیندور کی سوگندھ' میرا تیسرا ناول ہے۔اس سے قبل میرے دو ناول بعنوان 'اپنا اپنا سچ' اور 'آزادی' منظر عام پر آچکے ہیں۔ان دونوں ناولوں کا پس منظر کشمیر ہے جبکہ تازہ ناول پورے ہندوستانی معاشرے سے تعلق رکھتا ہے جس میں سماج کی خوبیوں اور کمیوں دونوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ناول نسائی عزم اور حصولیابیوں پر مرتکز ہے جس میں ایک عورت، جس کو ہم کمزور، بے بس، مجبور اور محتاج سمجھتے ہیں، ہمت اور حوصلے سے نئی نئی منزلیں طے کرتی ہے اور زندگی کی تاریک راہوں میں روشنی پھیلاتی ہے۔

ہمارا مشرقی معاشرہ ابتدا ہی سے نرینہ عصبیت کا شکار رہا ہے۔اس میں عام طور پر عورتوں کو دوسرے درجے کی مخلوق سمجھا جاتا ہے اور یہ باور کرایا جاتا ہے کہ وہ مرد کے زیر سایہ رہ کر ہی محفوظ زندگی گزار سکتی ہیں حالانکہ تاریخ گواہ ہے کہ عورتوں نے جس بھی میدان میں قدم رکھا وہاں اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔نسوانی کامرانی کی ہزاروں مثالیں دی جا سکتی ہیں۔مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ ان کی حصہ داری کے بغیر انسان نے اتنی ترقی نہیں کی ہوتی جتنی کہ موجودہ دور میں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔یہ حصہ داری زیادہ تر ان ممالک میں ممکن ہو سکی ہے جہاں عورت کی آزادی کو بُری نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے، وہ مرد کے شانہ بشانہ کام کرتی ہے اور انسان کا مستقبل سنوارنے میں دن رات جُٹی رہتی ہے۔اگر نوبیل انعامات کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو اس میں خواتین کی شرح فیصدی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔دراصل جو لوگ خواتین کو محکوم و مجبور سمجھتے ہیں وہ اپنی قوم سے نہ صرف دغا کرتے ہیں بلکہ قوم کی ترقی کے دروازے بند کرتے ہیں۔

اس ناول کا پلاٹ بہت برسوں سے میرے ذہن میں کروٹیں لے رہا تھا مگر مجھے ناول نویسی کی جانب نہ جانے کیوں عجیب سی ہچکچاہٹ محسوس ہوتی تھی جس کے سبب میں نے اس طرف توجہ نہیں دی۔ اس غیر آمادگی کی وجہ ایک تو میری متلون مزاجی رہی اور دوسری افسانہ نگاری کے ساتھ میری شدید رغبت۔ بہر حال دو برس پہلے میں نے پہلا ناول 'اپنا اپنا سچ' لکھنے کا مصمم ارادہ کیا اور اس میں کامیاب بھی ہوا، اس لیے وہ ابتدائی بے دلی خود بخود زائل ہوگئی اور اس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اس ناول کو بھی قارئین پسند فرمائیں گے اور اپنی قیمتی آرا سے نوازیں گے۔ انتظار رہے گا۔

وسندھرا، غازی آباد – ۲۰۱۰۱۲ دیپک بُدکی

۸/نومبر ۲۰۲۴ء

(۱)

’’آؤ موسی، کیسے آنا ہوا؟‘‘

’’بس یوں ہی۔ اس بچّی کو لے کر آئی ہوں۔ اسے اپنے پاس آشرم میں رکھ لو۔ لگتا ہے بے چاری اَناتھ ہے۔‘‘

’’کس کی بیٹی ہے...؟ تم بھی نا موسی....! کہاں کہاں سے ان یتیم اور لاوارث بچوں کو اُٹھا کر لاتی ہو۔‘‘

’’ہاں، سوچا کچھ تو پُنیہ کا کام کرلوں۔ ساری زندگی پیٹ کی آگ بجھانے میں صرف ہوگئی۔ اب تک گرہست کے جنجھال میں پھنسی ہوئی تھی سو اسے چھٹکارا مل گیا۔‘‘ موسی کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

’’موسی، بھگوان جو کرتا ہے بھلے کے لیے ہی کرتا ہے۔ میں بھی تو تمھاری بیٹی سمان ہوں۔ جب بھی کبھی ضرورت پڑے مجھ سے کہنے میں سنکوچ نہ کرنا۔‘‘

’’بیٹی، یہ تو میں جانتی ہوں۔ ایک تمہیں تو ہو جس کا مجھے سہارا ہے۔ تم پر مجھے پورا وشواس ہے۔ کس طرح تم نے اپنی زندگی سنواری میں تو حیران ہوں۔ خیر اس بچّی کو یہیں چھوڑے جاتی ہوں۔‘‘

’’موسی یہ تو بتادو کہ یہ کس کی اولاد ہے؟ اس کے ماں باپ کون ہیں؟ کہاں مل گئی تجھے؟‘‘

’’بیٹی، مجھے اُن کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں معلوم کہ وہ کون ہیں؟ ماں تو مر چکی ہے، باپ زندہ ہے یا نہیں، مجھے نہیں معلوم؟ بس یوں سمجھ لو یہ بے چاری قسمت کی ماری لاوارث ہے۔ کل میں یہاں سے قریباً تیس کلومیٹر دور ایک گاؤں میں اپنے رشتے داروں کو ڈھونڈنے چلی گئی تھی کیونکہ مجھے سننے میں آیا تھا کہ ایک روز قبل بھونچال نے وہاں بہت تباہی مچادی ہے۔

گاؤں اور اس کے گرد و نواح میں تو سب تہس نہس ہو چکا تھا۔ پہلے بحالی کیمپوں میں ڈھونڈتی پھری اور پھر نزدیک ہی ایک اسپتال میں پہنچ گئی جہاں مریضوں کا علاج چل رہا تھا۔ شاید اسپتال کہنا مناسب نہیں ہوگا کیونکہ وہ سرکاری ڈسپنسری تھی جہاں ہفتے میں دو بار ڈاکٹر اور کمپونڈر کے درشن ہوتے تھے۔ اسی ڈسپنسری کو ایمرجنسی میں اسپتال بنایا گیا ہے۔ یک منزلہ عمارت میں صرف تین کمرے ہیں جو کافی نہیں ہیں، اس لیے مریضوں کی تیمار داری کے لیے عارضی خیمے لگائے گئے ہیں۔ ایک بڑا سا خیمہ آپریشن کرنے کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ سرکار کی جانب سے بھیجی گئی ڈاکٹروں اور نرسوں کی ایک ٹیم آٹھوں پہر بیماروں کا علاج کرنے میں جٹی ہوئی ہے۔ میں نے وہاں بھی پوچھ تاچھ کرلی۔ رشتے دار تو ملے نہیں البتہ اسپتال کی سیڑھیوں پر اس بچّی کو روتے بسورتے دیکھ لیا۔ میں نے اِسے پچکارتے ہوئے رونے کی وجہ پوچھ لی لیکن یہ روتی چلی جارہی تھی اور منہ سے صرف 'ماں، ماں' پکار رہی تھی۔ پھر یہ میرے ساتھ ایسے لپٹ گئی کہ مجھے چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ میں نے اسپتال میں کئی لوگوں سے اس کے بارے میں پوچھ لیا لیکن کوئی حتمی طور پر کچھ بھی نہ بتا پایا۔ صرف اندراج کرنے والے بابو نے اتنا کہا کہ یہ اپنی زخمی ماں کے ساتھ یہاں لائی گئی تھی مگر اس کی ماں زخموں کی تاب نہ لاکر چل بسی اور اِس کو لینے کے لیے ابھی تک کوئی نہیں آیا۔"

"کون سے گاؤں گئی تھی موسی؟"

"پرہلاد پور..... کافی دور ہے یہاں سے۔ یہی کچھ پچیس تیس کلومیٹر ہوں گے۔ گاؤں پورے علاقے میں سب سے زیادہ خوشحال مانا جاتا تھا۔ مکانات اکثر و بیشتر پختہ اینٹوں سے بنے ہوئے تھے۔ وہاں پر مہینے میں مقررہ دنوں پر اناج، دالوں اور مویشیوں کی منڈی لگ جاتی تھی جیسے کوئی میلہ لگا ہوا ہو۔ دن بھر بھاؤ تاؤ ہوتا تھا۔ کسان زیادہ تر جُتائی کے لیے بیل خریدنے آجاتے تھے۔ تھوک بیوپاریوں کے علاوہ خردہ فروش بھی نظر آتے تھے جن سے عام لوگ اپنی ضرورت کی چیزیں سستے داموں پر خرید لیتے تھے۔ پاس میں ایک کالی مندر بھی تھا جس میں یہاں آئے سبھی لوگ حاضری دیتے اور ماں کالی کی پوجا ارچنا کرتے۔ میں بھی کئی بار

وہاں گئی ہوں اور وہاں کی گہما گہمی دیکھ کر دھنگ رہ جاتی۔ لیکن اس بار وہاں کے حالات دیکھ کر میرے حواس باختہ ہوگئے۔ اکثر و بیشتر مکانات زمین بوس ہو چکے ہیں۔ بیسیوں لوگ مر چکے ہیں اور جو بچ گئے ہیں وہ یا تو اپنے رشتے داروں کے پاس سر چھپانے چلے گئے ہیں یا پھر انھوں نے سرکاری کیمپوں میں پناہ لی ہے۔ سیکڑوں لوگ زخمی ہو چکے ہیں اور بہت سوں کی دماغی حالت بگڑ چکی ہے۔ نزدیک ہی ایک چھوٹی سی سرکاری ڈسپنسری ہے جس کو لوگ اسپتال سمجھتے ہیں۔ اس کی مختصر سی عمارت بھی متاثر ہو چکی ہے۔ اسی کے احاطے میں عارضی خیمے لگا کر مریضوں کی دیکھ بھال کی جا رہی ہے۔ ہر طرف ہُو کا عالم ہے۔ کوئی کسی کی سننے کو تیار ہی نہیں۔

اسی اسپتال کی سیڑھیوں پر میری نظر اس کمسن لڑکی پر پڑی۔ بے چاری پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنوں کو ڈھونڈ رہی تھی اور اکیلی رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔ آس پاس کئی لوگوں سے پوچھ لیا انھوں نے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ اس سے پہلے کہ یہ غنڈوں بدمعاشوں کا نوالہ بن جاتی اور جسمانی منڈی میں انسان نما چیلوں کا چارا بن جاتی، میں نے اس کو اپنے ساتھ لے جانا ہی مناسب سمجھا کیونکہ مجھے تم پر پورا بھروسہ تھا۔''

پرہلاد پور کا نام سنتے ہی سُچیتا راٹھور کے کان کھڑے ہوگئے۔ اس کے بدن میں کپکپی سی دوڑنے لگی۔ نہ جانے کیوں یہ نام اس کو کچوکنے لگا۔ اس نے ایک بار پھر گاؤں کا نام پوچھ لیا۔

''موسی کیا نام بتایا تم نے اس جگہ کا.....؟'' پھر کچھ سوچ کر اس نے خود ہی اس گاؤں کا نام لیا۔

''شاید پرہلاد پور کہا تھا تم نے....؟''

''ہاں بیٹی پرہلاد پور۔ کیا تم اس گاؤں سے واقف ہو؟ کیا تمھارا کوئی رشتے دار وہاں رہتا ہے؟''

''نہیں موسی، نہ تو میں وہاں رہی ہوں اور نہ ہی میرا کوئی رشتے دار وہاں رہتا ہے۔ البتہ اس گاؤں کے ساتھ بہت پرانی یادیں وابستہ ہیں۔''

''بیٹی، تم تو نام سنتے ہی چونک گئی تھی، ضرور کوئی دل خراش بات ہوئی ہوگی۔ تم کو میں نے اس سے پہلے اتنا جذباتی ہوتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔''

''ہاں موسی، تم سے کیا چھپانا، بات ہی کچھ ایسی ہے۔ خیر چھوڑو اس بات کو، اس پر پھر کبھی چرچا کریں گے۔ پہلے یہ سمجھ لو کہ تم اس لڑکی کو اٹھا کر تو لائی ہو، نہ تو اس کے ماں باپ اور نہ ہی بھائی بہن کا کچھ پتہ ہے۔ کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں، کچھ تو پتہ کرنا چاہیے تھا۔''

''سُچیتا بیٹی، ظاہر ہے اس بیچاری کا کوئی بھی نہیں ہے۔ مریضوں کا اندراج کرنے والے بابو نے بتایا کہ اس کی ماں مر چکی ہے۔ سر پر چھت گرنے کی وجہ سے وہ شدید طور زخمی ہو گئی تھی اور اسپتال پہنچتے ہی اس نے دم توڑ دیا تھا۔ بہت کوشش کرنے کے باوجود اس لڑکی کے باپ یا کسی رشتے دار کا پتہ نہیں چل سکا۔ بیٹی، اس زلزلے کے سبب درجنوں بچے یتیم ہو چکے ہیں لیکن بہت سوں کو ان کے رشتے داروں نے سہارا دے دیا۔ تمھیں تو معلوم ہی ہے کہ غلط کار لوگ ایسے ہی موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں اور ایسی آفتوں کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ یتیم بچوں کی ٹوہ میں رہتے ہیں کہ کب کوئی شکار مل جائے اور اس کو ٹھکانے لگا سکیں۔ ایسی سماوی آفتوں سے تو ان کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔''

''تم سچ کہتی ہو موسی، انسان کے اندر شیطان چھپا رہتا ہے جو اس کو غیر فطری کام کرنے کے لیے ہمیشہ اکساتا رہتا ہے۔ اچھے اور نیک صفت لوگ اندر کے اس شیطان سے اپنا بچاؤ کرتے ہیں مگر بدطینت لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ کل ان کے یا ان کے بال بچوں کے ساتھ بھی ایسا ہو سکتا ہے۔''

''بیٹی، سنا ہے یہ لوگ بچوں کو اغوا کر کے انھیں جسمانی منڈیوں میں بیچ ڈالتے ہیں اور خوب پیسہ کما لیتے ہیں۔ اغوا شدہ بچوں کو بُرے کاموں میں لگایا جاتا ہے۔ لڑکیاں جسم فروشی پر مجبور ہو جاتی ہیں جبکہ لڑکے چوری چکاری، دلالی، دارو اور منشیات کی تسکری میں پھنس جاتے ہیں۔ ان کم سِنوں کی یادداشت اور شناخت مٹانے کے لیے انھیں دور دراز اجنبی شہروں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ کوئی ممبئی، کوئی دہلی، کوئی بنگلور اور کوئی کولکتہ کی نذر ہو جاتا ہے۔''

''انسانی تاریخ ان بدکاروں کے کرتوتوں سے بھری پڑی ہے۔ جب سے زمین پر انسان کا ظہور ہوا ہے تب سے خطا کاری اور جسم فروشی بھی وجود میں آئی ہے۔''

''کتنی عجیب سی بات ہے بیٹی۔ اور پھر ہم اپنے اعمال کے بدلے نصیب کو کوستے رہتے ہیں۔''

''خیر موسی، میں تو اس لڑکی کو آشرم میں رکھ لوں گی مگر تمھیں کچھ اور کام کرنا پڑے گا کیونکہ آج کل پولیس بہت پوچھ گچھ کرتی ہے اور ان کو اطلاع دینے کے بغیر ہم اس اناتھ آشرم میں کسی کو پناہ نہیں دے سکتے ہیں۔''

''بتاؤ بیٹی، میں کچھ بھی کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

''ہفتے دو ہفتے کے اندر تمھیں اس گاؤں میں دوبارہ جانا پڑے گا۔ تب تک متاثرین واپس اپنی باز آبادکاری میں جٹے ہوں گے۔ وہاں اس لڑکی کے بارے میں پتہ لگانا پڑے گا۔ کون ہے، کیا نام ہے، باپ اور ماں کا کیا نام ہے اور رہتی کہاں پر ہے؟ پہلے ماں کا نام اسپتال سے معلوم کرلو اور پھر اسی حوالے سے اس کا بھی سراغ مل جائے گا۔ تم اس کا فوٹو بھی ساتھ رکھ لینا تاکہ جانکار لوگ اس کے بارے میں کچھ بتا سکیں۔''

''ٹھیک ہے بیٹی، میں پندرہ دن کے اندر اندر اس بارے میں ساری معلومات اکٹھا کر کے تم کو آگاہ کرلوں گی۔''

''موسی، ایک بات پوچھ لوں اگر تم بُرا نہ مانو تو۔''

''ارے بیٹی، تمھاری بات کو میں برا مانوں، ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔''

''تم کسی لوبھ موہ کے بغیر اس آشرم کے ساتھ جڑی ہو۔ میں تمھیں کوئی باقاعدہ تنخواہ نہیں دیتی ہوں پھر بھی تم بے لوث یہ کام خوشی خوشی کرتی ہو، اس کی کیا وجہ ہے؟''

''بیٹی یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ میرے پتی دیو کسان تھے اور ان کی اسی گاؤں میں تھوڑی بہت زمین تھی۔ دو اولاد تھی، ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ جوں توں گزارہ ہو رہا تھا۔ وہ اچانک بیمار پڑ گئے اور میں نے ان کو شہر کے اسپتال میں بھرتی کرا دیا۔ وہاں ان کا آپریشن ہوا۔ میرے پاس تو کوئی سرمایہ نہیں تھا اس لیے زمین گروی رکھنی پڑی جو قرضہ نہ دینے کے سبب آخرکار ساہوکار نے ہڑپ کرلی۔ خوش قسمتی سے میں نے اپنی ماں سے دائی جنائی کا کام سیکھ لیا تھا اور

وقتِ ضرورت میں یہ کام شادی کے بعد بھی کرتی تھی۔ میرا اصلی نام مانسی ہے اور لوگ مجھے مانسی موسی کے نام سے پکارتے تھے جو بعد میں سکڑ کر صرف موسی رہ گیا۔ جب میرے پتی اس دنیا میں نہیں رہے تو میں نے اسی کام کو اپنایا اور اپنا گزارہ کرتی رہی۔ بیٹی کی شادی پاس ہی کے گاؤں میں کر لی لیکن اس کا پتی مزدوری کرنے کے لیے شہر چلا گیا اور پھر وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ دیر سویر بیٹی کبھی اپنی صورت دکھاتی تھی مگر جب سے وہ بچوں کے جنجال میں پھنس گئی اس کو بھی فرصت نہیں ملتی۔ اس کو دیکھے اب چار سال ہو گئے۔ اِدھر بیٹے پر آس لگائے بیٹھی تھی، وہ پڑھ لکھ کر ممبئی بھاگ گیا۔ بارہ جماعت پڑھ لیے، سوچا تھا بڑھاپے میں مجھ بیوہ کا کچھ سہارا بن جائے گا۔ دو سال سے اس کی بھی صورت نہیں دیکھی ہے۔ کوئی چٹھی پتری بھی نہیں بھیجتا۔ نہ جانے کہاں ہوگا؟ پینتالیس کی ہو چکی ہوں، ابھی ہاتھ پیر کام کر رہے ہیں۔ دائیں بائیں کوئی بھی تو اپنا نہیں ہے اس دنیا میں۔ چند ایک رشتے دار دور دراز گاؤں میں رہتے ہیں مگر کسی کو میری فکر نہیں ہے۔ سوچتی ہوں کہ کل کو اگر کچھ ہو جائے گا تو میرا کیا ہوگا؟ تب سے تمھارے اس آشرم سے جڑی ہوئی ہوں۔"

"مانسی بہت پیارا نام ہے موسی۔ بھگوان تم کو لمبی عمر اور اچھی صحت دے۔ مجھے یقین ہے کہ دیر سویر تمھارے بیٹے کو ماں کی ممتا ضرور کھینچ لائے گا۔ بیٹی بھی بچوں سے فارغ ہو کر تمھارے پاس ضرور آئے گی ایسا میرا ماننا ہے۔ تم مایوس نہ ہو۔ بھگوان کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ رہی بات کہ تمھارا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے، ایسی بات پھر کبھی منہ پر نہیں لانا۔ میں تمھاری بیٹی ہوں موسی اور جب تک زندہ ہوں تب تک تمھاری دیکھ بھال کروں گی۔ اطمینان رکھو۔ بھگوان ایک سہارا چھین لیتا ہے تو کئی سہارے سامنے لا کر رکھ دیتا ہے۔ اس بچّی کی طرف ہی دیکھو، اِدھر ماں بچھڑ گئی اور اُدھر تم مل گئی اور اس کو اپنا بنا لیا۔ یہی فطرت کا قانون ہے۔"

(۲)

ابھی دس ہی دن گزر چکے تھے کہ موسی سُچیتا راٹھور سے ملنے اس کے کمرے میں آ گئی۔ آتے ہی اس کا سواگت ان الفاظ سے ہوا۔

''پرنام موسی! نام وغیرہ کچھ معلوم ہوا کیا؟

اسے ایسا محسوس ہوا کہ سُچیتا اسی کا انتظار کر رہی تھی۔

''ہاں بیٹی کچھ کچھ تو معلوم کر لیا۔لڑکی چار سال پہلے پیدا ہوئی تھی اور اس کا نام کوشکی رکھا گیا تھا۔اس کے پتا کا نام کوشل ورما ہے۔اس کی ماں، جس کا دیہانت ہو گیا، کا نام رجنی تومر تھا جو شادی کے بعد رجنی ورما ہو گیا۔کوشل ورما تین برس پہلے اپنی بیوی کو چھوڑ کر ممبئی چلا گیا تھا اور رجنی اپنی بیٹی کے ساتھ پرہلاد پور کے آبائی مکان میں ہی رہنے لگی جہاں بھونچال کے سبب چھت گر گئی اور وہ اس کے ملبے میں دب گئی۔ بیٹی خوش قسمت تھی کہ اس سمئے باہر میدان میں کھیل رہی تھی اس لیے بچ گئی۔ پڑوسیوں نے ماں کو ملبے سے نکال دیا اور بیٹی سمیت دونوں کو اسپتال پہنچا دیا۔''

کوشل ورما کا نام سنتے ہی سُچیتا کے کان کھڑے ہو گئے۔وہ کچھ وقفے کے لیے سوچ میں پڑ گئی۔جھنجلاتے ہوئے اس کے منہ سے دھیمی آواز میں کچھ الفاظ اُبل پڑے۔

پرہلاد پور..............!

وشل ورما............!

رجنی تومر.............!

کوشکی ،ان کی بیٹی....!

یہ کیسا اتفاق ہے.......!

وہ جیسے سکتے میں آ گئی۔اس کے بعد موسی سے مخاطب ہوئی:

''اوہ میں سمجھی۔تو یہ کوشل ورما کی بیٹی ہے۔''

''ہاں بیٹی، اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کیا تم اس کے باپ کو جانتی ہو؟''

''زندگی میں ایک بار سامنا ہوا تھا مگر اس کے بعد پھر کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ اس ایک ملاقات نے میری زندگی میں اُتھل پتھل مچا دی تھی۔ خیر چھوڑ و ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ کہ تم نے پولیس تھانے میں رپورٹ لکھوائی کیا؟''

''نہیں بیٹی۔ میں پولیس اور کورٹ کچہری کے چکّر میں نہیں پڑنا چاہتی۔ انھیں جو کرنا ہو گا کر لیں۔ مجھے کوئی چنتا نہیں ہے۔''

''نہیں موسی، یہ تم نے ٹھیک نہیں کیا۔ کل کو ہمارے خلاف پولیس کیس ہو سکتا ہے۔ کوشل ورما راستے پر پڑا ہوا کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ وہ دولتمند ہے اور دولت نے ہی اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ وہ کبھی بھی ہم پر کیس کر سکتا ہے اور ہم پر چوری کا الزام لگا سکتا ہے۔ پھر اس لڑکی کے اور بھی تو رشتے دار ہوں گے۔ اس لیے ہمیں ہوشیاری سے کام لینا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے، جیسے تم مناسب سمجھو، کر لیں گے۔''

''ہمیں کل ہی پولیس کو خبر دینی پڑے گی۔ تمھیں میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔''

''جیسے تمھاری مرضی۔''

دوسرے روز سُچیتا راٹھور نے پولیس تھانے میں رپورٹ لکھوائی۔ تھانیدار نے مانسی موسی سے کئی سوالات پوچھے۔

''یہ بچّی تمھیں کہاں ملی؟''

''وہ جو پر ہلاد پور کے نزدیک اسپتال سا بنا ہے، وہیں اسپتال کی سیڑھیوں پر۔''

''تم وہاں کیوں گئی تھی؟''

''بھونچال کے بارے میں سن کر میں اپنے رشتے داروں کو ڈھونڈنے پر ہلاد پور گئی تھی۔ وہاں کسی نے کہا کہ شاید بحالی کیمپوں یا پھر اسپتال میں ہوں گے، اس لیے چلی گئی۔''

''تم نے اس لڑکی کو ہی کیوں اٹھا لیا، وہاں تو بیسیوں لڑکیاں تھیں؟''

''میں نے زبردستی نہیں اٹھایا صاحب۔ یہ لڑکی رو رہی تھی، مجھ سے رہا نہیں گیا اس لیے اس کو چُپ کرانے کی خاطر اس کو پچکار لیا۔ اس کے بعد وہ میرے ساتھ ایسے چپک گئی کہ میری گود سے اترنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔''

''اسپتال والوں سے اس کے بارے میں پوچھا نہیں؟''

''وہاں کوئی اس کو پہچان ہی نہیں پایا۔ اندراج کرنے والے بابو نے کہا کہ اس کا کوئی نہیں ہے۔ اس کی ماں زخمی حالت میں لائی گئی تھی مگر وہ زخموں کی تاب نہ لا کر مر گئی۔ رجسٹر میں اس کا نام رجنی ورما درج کیا گیا ہے۔ میں نے سوچا کہ بے چاری کہاں جائے گی اس لیے اپنے ساتھ لے آئی اور دیدی کے حوالے کر دیا۔''

''دیدی کون؟''

''صاحب آپ دیدی کو نہیں جانتے؟ یہ جو میرے ساتھ بیٹھی ہے اسی کو دیدی کہتے ہیں۔ یہ وَردان اَناتھ آشرم چلاتی ہیں جہاں یتیموں اور بے سہارا بچوں کی دیکھ بھال ہوتی ہے۔''

''اوہ، آپ کا نام؟''

''میرا نام سُچیتا راٹھور ہے۔ یہاں بھوانی پور میں ایک یتیم خانہ کھول رکھا ہے۔ وہیں پر اَناتھ بچوں کی سیوا کرتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔ تم لوگ اس لڑکی کو اپنے پاس ہی رکھو جب تک ہم اس کے رشتے داروں کا پتہ لگائیں گے۔''

پھر دونوں واپس اپنے آشرم چلی آئیں۔

اس تفتیش کی وجہ سے بے خطا موسی کا تجسس بڑھ گیا۔ وہ کچھ ماہ بعد دوبارہ لڑکی کے رشتہ داروں کو ڈھونڈنے پرہلاد پور گاؤں چلی گئی۔ گاؤں کے اکثر لوگ واپس آ گئے تھے اور اپنے ٹوٹے پھوٹے گھروں کی مرمت کرنے میں مصروف تھے۔ بے چاری نے جوکھم اٹھا کر بہت کچھ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ اسے معلوم ہوا کہ کوشل ورما ایک زمیندار کا بیٹا ہے جو ساہوکاری

کا کام بھی کرتا تھا۔ بہت عرصہ پہلے وہ معقول جہیز نہ ملنے پر پاس ہی کے ایک گاؤں بھوانی پور سے اپنی برات واپس لے آیا تھا اور پھر اپنے ہی گاؤں میں ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھنے والی رجنی تومر سے شادی کر لی تھی جس کی وساطت سے اس کو کافی دولت بطور جہیز مل گئی۔ اس نے اپنی اور بیوی کی دولت عیش و عشرت میں اُڑا دی اور پھر بیوی کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔ کوشکی اسی جوڑے کی بیٹی ہے۔

کچھ روز بعد پولیس تفتیش کے لیے آشرم پہنچ گئی اور کوشکی کی تصویر اتار کر قومی و مقامی اخباروں میں اس کے بارے میں خبر چھاپ دی تا کہ اس کے لواحقین کو معلوم ہو جائے کہ وہ زندہ ہے اور پولیس کے پاس محفوظ ہے۔ اس کے باوجود کوئی سامنے نہیں آیا یہاں تک کہ حیاتیاتی باپ نے بھی لڑکی پر حق جتانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ وہ تو اس بارے میں بہت ہی سنگدل ثابت ہوا۔ ورنہ تو سارے ملک میں پرہلاد پور گاؤں کے بھونچال کی خبر پھیل چکی تھی۔

''اس کا یہ مطلب ہوا کہ اس لڑکی کا کوئی رشتے دار نہیں ہے۔'' تھانہ انچارج اور اس کے ماتحت سپاہیوں نے آپس میں گفتگو کرتے ہوئے نتیجہ اخذ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے لڑکی کو یتیم خانہ میں رکھنے پر کوئی عذر نہیں کیا۔

''خیر کوئی بات نہیں، میں نے پولیس تھانے میں ضروری کاغذی کارروائی مکمل کر لی ہے اور اب کوشکی یہیں رہے گی۔'' سُچیتا نے اہم کاغذات کو فائل کر کے موسی کو مخاطب کیا اور اسے جانکاری دے دی۔

(۳)

پرہلاد پور گاؤں میں معاملے کی چھان بین کر کے موسی نے سُچیتا راٹھور کو سارا ماجرا بیان کیا۔ وہ موسی کی باتیں ہمہ تن گوش سنتی رہی اور منہ سے کچھ نہ بولی۔ اس کے اندر ایک ہیجان سا برپا ہو رہا تھا پھر بھی اس نے اپنے چہرے کو سنجیدہ بنائے رکھا تا کہ اس کے دل کی حالت چہرے

پر ظاہر نہ ہو۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی اور دھیرے دھیرے نہ جانے کس جہاں میں کھوگئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بچپن سے لے کر شادی کے سانحے تک کے سارے مناظر گھومنے لگے۔

سُچیتا راٹھور ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کے پتا جی رام سرن راٹھور بذاتہٖ ایک کسان تھے اور کسانی کے ساتھ ساتھ اپنے گاؤں بھوانی پور میں ایک چھوٹے سے برانچ پوسٹ آفس کا کام بھی سنبھالتے تھے۔ ان دنوں اس کی آمدنی سوا سو روپے ہوا کرتی تھی۔ لوگ ڈاک خانے کے ملازمین کی بڑی عزت کرتے تھے کیونکہ وہ ایمان دار ہوتے تھے۔ چار سال نوکری کرنے کے بعد محکمے کا امتحان پاس کر کے اس کی تقرری مستقل طور پر بحیثیت پوسٹ مین ہوگئی اور پھر دو سال بعد ایک اور ڈیپارٹمنٹل امتحان پاس کر کے پوسٹل اسسٹنٹ بن گیا مگر مصیبت یہ تھی کہ اسے گاؤں چھوڑنا پڑا۔ وہ قریبی شہر کے ہیڈ پوسٹ آفس میں تعینات ہوا جہاں وہ پہلے اکیلا چلا گیا اور پھر اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے کر گیا۔

سُچیتا کا جنم شادی کے کئی سال بعد ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ ماں باپ نے بچے کی امید ہی چھوڑ دی تھی۔ دو بار تو گاؤں کی دائی نے بہت کوشش کی تھی کہ بچہ صحیح سلامت پیدا ہو مگر ناکام رہی۔ خوش قسمتی سے اس بار شہر میں پوسٹنگ ہونے کے باعث اس کی بیوی کا علاج سرکاری اسپتال میں نسائی امراض کے ڈاکٹر نے کیا۔ اس نے حاملہ عورت کا معائنہ کر کے اس کو چند دوائیاں اور کچھ ضروری ہدایات دیں جن میں مکمل آرام سب سے اہم تھا۔ قسمت نے بھی یاوری کرلی اور معینہ وقت پر اس نے مادہ اولاد کو جنم دیا۔ گھر میں خوشیوں کی لہر دوڑ گئی۔ البتہ اس کے بعد پھر کبھی سُچیتا کی ماں کسی اور بچّے کو جنم نہ دے سکی۔ اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے سُچیتا کو بڑے ہی نازوں کے ساتھ پالا گیا۔ پانچ سال بعد نزدیک ہی ایک پرائمری اسکول میں اس کا داخلہ کرایا گیا۔ وہ بہت ہی ذہین ثابت ہوئی۔ امتیازی نمبروں سے ہر امتحان میں پاس ہوجاتی جب تک اس نے پانچویں جماعت پاس کرلی۔ پھر نزدیک ہی ہائیر اسکینڈری اسکول سے بارہویں کا امتحان کامیاب کیا۔ چنانچہ اس کی دلچسپی آرٹس مضامین میں تھی اس لیے بارہویں کے بعد کالج میں آرٹس اسٹریم میں داخلہ لیا۔

کالج میں اس کی دوستی بھاسکر بھاردواج سے ہوئی۔قدیم زمانے میں بھاردواج ذات صرف برہمنوں کے لیے مخصوص تھی جو خود کو بھاردواج رِشی کی اولاد سمجھتے تھے۔ بعد میں درجہ فہرست ذاتوں نے بھی اپنے نام کے ساتھ بھاردواج لکھنا شروع کر دیا۔اب صورت حال یہ ہے کہ اس ذات کا ذکر آتے ہی اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کا ماتھا ٹھنکتا ہے۔ دونوں کی آپس میں شادی ہونا ناممکن ہے۔تاہم یہ جانتے ہوئے بھی سُچیتا اس کی جانب کھنچتی چلی گئی کیونکہ اس کو بھاسکر کی شخصیت اور اس کا وتیرہ بہت ہی مہذب لگتا تھا۔ بھاسکر نے بہت کوشش کی کہ وہ سُچیتا سے دور ہی رہے اور اس کے قریب نہ آئے کیونکہ اس کو اپنی سماجی معذوری کا بخوبی علم تھا۔اس کے باوجود رفتہ رفتہ دونوں کے دلوں میں بغاوت کی زیریں لہر اٹھنے لگی۔

دراصل ہندوستانی تہذیب دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک ہے جہاں رسم و رواج ہزاروں سالوں سے چلتے آرہے ہیں۔ یہ رسمیں سماج کی رگ رگ میں سما گئیں ہیں اس لیے ان سے انحراف کرنا فرد کے لیے بہت مشکل ہے جیسے ستی پرتھا، بیواؤں کی دوبارہ شادی ،بال وِواہ، ذات پات، جہیز کی بدعت وغیرہ۔ بہرکیف اتنا تو یقینی ہے کہ یہ روائتیں عرش سے نازل ہوئے کسی صحیفے میں درج نہیں ہیں جن کو بدلنا ناممکن ہو۔ ہندوسماج کے لیے بنائے گئے سبھی قانون انسانی ذہن کی اختراع ہیں اور زمانے کے ساتھ ساتھ متفقہ طور پر بدلے جا سکتے ہیں۔خوش قسمتی سے ماضی میں ہمارے سماج کے کئی رہنماؤں نے لوگوں کو ستی کے معاملے میں اپنے براہین سے قائل کر دیا اور اس رسم پر سرکار سے پابندی لگوانے میں کامیاب ہو گئے۔بال وِواہ کے خلاف بھی مہم چلائی گئی اور کافی حد تک کامیابی ملی مگر دیکھنے میں آتا ہے کہ اب بھی کئی اندرونی علاقوں میں نابالغ لڑکیوں کی شادیاں رچائی جاتی ہیں۔اسی طرح بیواؤں کی دوبارہ شادی پر کئی رہنماؤں نے آندھولن چلائے اور اس میں کچھ حد تک کامیابی حاصل کر لی مگر اس معاملے میں خود بیواؤں میں ایک عجیب قسم کی ہچکچاہٹ سی نظر آتی ہے۔آزادی کے بعد کئی ایسے قانون بنائے گئے جن کی رو سے ذات پات، جہیز کی لین دین، مقررہ عمر سے پہلے بچوں کی شادی کرنا وغیرہ جرم قرار دیے گئے مگر پھر بھی یہ رسمیں اب تک نبھائی جا رہی ہیں اور ان کا

تدارک نہیں ہورہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قانون بنانا ایک بات ہے اور اس پر عمل کرنا یا عمل کروانا دوسری بات۔ اگر سماج اور سرکار کسی قانون کی جان بوجھ کر ان دیکھی کرے اور اس کو لاگو کرنے کے لیے سختی سے کاربند نہ ہو تو وہ قانون کاغذ کا پرزہ بن کر فائیلوں میں دب کر رہ جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو مذکورہ بدعتوں میں سے بیشتر بدعتیں عورتوں سے متعلق ہیں۔ ان مسائل میں سب سے خطرناک مسئلہ ذات پات کا ہے جو کئی رہنماؤں کی تحریکوں کے باوجود آج تک ہمارے سماج میں قائم ودائم ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میٹرو پولیٹن شہروں میں ذات پات کی منافرت کھل کر دیکھنے کو نہ ملے مگر گاؤں اور قصبوں میں لوگ اپنی ذات کی حفاظت کرنے میں کسی بھی حد تک جانے کو تیار رہتے ہیں۔ گاؤں کی کھپ پنچائتوں کا حکم پتھر پر لکیر کی مانند ہوتا ہے اور کئی بار عشاق کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندو مذہب میں کوئی صحیفہ آسمان سے نازل نہیں ہوا۔ یہاں وید ہیں، اپنشد ہیں، پُران ہیں، منوسمرتی ہے، مہابھارت ہے، رامائن ہے اور سب سے بڑھ کر شریمد بھگوت گیتا ہے۔ اکثر و بیشتر کتابیں رِشیوں مُنیوں نے مختلف وقتوں پر قلم بند کی ہیں۔ چنانچہ یہ مذہب بہت پرانا ہے اس لیے قدیم دور کے سماجی و اخلاقی طور طریقوں کی ان صحیفوں میں جھلک ملتی ہے اور اسی لحاظ سے معاشرے کے قانون بھی بنائے گئے ہیں۔ ان کتابوں میں ایک کا نام منوسمرتی ہے جس میں کام یا پیشے کے لحاظ سے سماج کو چار ذاتوں میں تقسیم کیا گیا ہے، برہمن، کھشتری، ویش اور شودر۔ لگتا ہے یہ اصول بناتے وقت کسی بدنیتی کا ارادہ نہیں تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ عمل میں لانے کے دوران ان میں بہت سارے نقائص پیدا ہوگئے۔ علاوہ ازیں اس بندوبست کو کوئی سماوی منظوری نہیں ہے بلکہ یہ انسان کے بنائے ارضی قانون ہیں جو صدیوں سے چلے آرہے ہیں اور سماجی نفسیات کا حصہ بن چکے ہیں۔ ان کی حفاظت کے لیے مذہبی ٹھیکے دار اپنی ذاتی منفعت کی خاطر جی جان سے مصروف رہتے ہیں۔ وہ ان کو کسی طور ہلکا یا رقیق نہیں ہونے دیتے۔ ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ جب یہ کتاب لکھی گئی تھی تو اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ محنت کی تقسیم کاری ہو اور معاشرے کے مختلف اراکین کے لیے ان کے

رہتے، حصہ داری اور اہمیت کی نشاندہی ہو سکے مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس کی کئی تاویلیں پیش کی گئیں اور اس کا اصل مدعا فوت ہوتا چلا گیا۔ نتیجتاً ہمارا سماج طبق دار اور پرت دار بن گیا جس کی وجہ سے اس نظام میں بہت سی بدعتیں داخل ہو گئیں اور اب تک وہ یوں ہی چلی آ رہی ہیں۔ باوجودیکہ آزادی کے بعد ہمارے دستور میں اس بدعت کو ختم کرنے کے لیے کئی اقدامات اٹھائے گئے لیکن عملی طور پر یہ اصلاحات ابھی تک سماج کے ہر طبقے کو متاثر نہیں کر سکے۔ افسوس کہ آج بھی یہ بدعت ہندو سماج کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔

(۴)

بھاسکر بھاردواج اور سُچیتا راٹھور کے درمیان بے لوث عشق تھا۔ گو سوزِ عشق سے ابھی نا آشنا تھے اور یہ نہیں جانتے تھے کہ بے لوث محبت انتہائے عشق کو کیسے پہنچے گا۔ ایک دوسرے سے نہ کوئی غرض تھی اور نہ ہی کوئی توقع، بس ایک چاہت تھی جو روز بروز بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ وہ نہ تو اپنے عشق کا کھلے طور اظہار کرتے تھے اور نہ ہی اس کی تشہیر کرنے میں کوئی دلچسپی رکھتے تھے۔ دونوں کا نظریۂ حیات اور طولِ موج یکساں تھا۔ کالج میں پہلے ہی سال کے دوران دونوں ایک دوسرے کی کارکردگی سے کافی متاثر ہو گئے۔ چنانچہ دونوں کو تحصیل علم سے بہت رغبت تھی اور امتحان میں امتیازی نمبرات حاصل کرنے کی آرزو تھی اس لیے ایک دوسرے سے رشک بھی کرتے تھے اور سبقت لینے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ دونوں فرصت کے وقت لائبریری میں نظر آتے تھے۔ وہاں ایک دوسرے سے بات کرنا مناسب نہ تھا مگر آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو دل میں اتارتے تھے۔ پہلے سال دونوں کے نتائج دیکھ کر نہ صرف ان کے اساتذہ بلکہ ان کے والدین کو بھی فخر محسوس ہوا۔ کبھی کبھار کالج کے کینٹین میں ملاقات ہو جاتی تھی، مل کر چائے اور ناشتہ کرتے تھے اور آگے کے منصوبوں کے بارے میں تبادلۂ خیال کرتے تھے۔

''بھاسکر، گریجویشن مکمل کر کے تمھیں آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے؟''
''سُچیتا جی، ابھی تو کچھ بھی نہیں سوچا ہے۔ جب سمئے آئے گا تو سوچ لوں گا۔''
''اسی کو کہتے ہیں آگ لگنے کے ٹائم پر کنواں کھودنا۔ سوچنا تو ابھی سے چاہیے۔''
''ہاں سُچیتا جی، آپ کی بات صحیح ہے۔ مگر انسان کی بہت ساری مجبوریاں ہوتی ہیں، ایک پرانی کہاوت ہے جس کے پاس سونا ہوتا ہے اس کے پاس کان نہیں ہوتا اور جس کے پاس کان ہوتا ہے اس کے پاس سونا نہیں ہوتا۔ کوئی بھی پلان بنانے سے پہلے آدمی کو اپنے وسائل پر نظر ڈالنا ضروری ہے کہ کیا وہ اس کی اجازت دیتے ہیں کہ آدمی اپنے قدم آگے بڑھائے۔''
''ایسی بھی کونسی مجبوری ہے۔ آپ تو چشم بددور اتنے ذہین ہیں، کچھ تو نقشۂ راہ بنا لیجیے اور اس پر فوکس کیجیے۔''
''سُچیتا جی، میرے پاس نہ تو اتنے وسائل ہیں اور نہ ہی اتنی فرصت ہے کہ نقشۂ راہ بنالوں اور پھر اس پر عمل کروں۔ جیسے جیسے ہوا چلتی رہے گی اسی کے حساب سے اپنی کشتی کا بادبان موڑتا رہوں گا۔''
''یہ 'سُچیتا جی، سُچیتا جی' کیا لگا رکھا ہے۔ ہم کلاس فیلو ہیں، دوست ہیں۔ پھر یہ تکلف کیوں؟ مجھے تو آپ کہنا بھی اچھا نہیں لگتا۔''
بھاسکر خاموش رہا۔ اس کے بعد سُچیتا دوبارہ گویا ہوئی۔
''بھاسکر، میری مانو تو تم آئی اے ایس کی تیاری کرلو۔ میری دلی خواہش ہے کہ تمھیں ایک روز ڈی ایم کی کرسی پر براجمان دیکھ لوں۔''
''میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ میں اس مشورے پر غور کرلوں گا۔ ابھی تو فی الحال سالانہ امتحان پاس کرنے کی تیاری کرنی ہے۔''
''پھر وہی آپ؟ یہ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ چلو اب کلاس میں جانا چاہیے۔ پھر کبھی مستقبل کے پلان پر بات کریں گے۔''
''جی ہاں۔ ٹائم ہوگیا۔ پروفیسر آچکا ہوگا۔'' دونوں اٹھ کر اور کاونٹر پر بل پیمنٹ کر کے،

اپنے کلاس روم کی طرف چل دیے۔

اگلے دو برسوں کے دوران وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔ کبھی اکٹھے سینما دیکھنے چلے جاتے اور خالی ٹائم میں کسی ریسٹورنٹ میں چائے ناشتہ کرنے چلے جاتے۔ وہاں پر وجود سے متعلق فلسفیانہ باتیں ہوتیں۔ زندگی کے مقصد، نصب العین اور فوکس پر، ایمان داری اور دولت کے ناجائز استعمال پر، سرمایہ داری اور کمیونزم پر، خود غرضی اور خدمت خلق پر۔ ان کے لیے تو یہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ شاید سقراط بھی یوں ہی اپنے چیلوں کو پکڑ پکڑ کر ان سے ہم کلام ہو جاتے تھے۔ علم حاصل کرنے کا یہ طریقہ بہت ہی ثمر آور ہے۔

مصیبت تو یہ ہے کہ جہاں عشق کی بازی کھیلی جاتی ہے وہاں ضروری ہے کہ رقیب بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ کالج میں چند ایسے شرارتی لڑکے بھی تھے جو ہر لڑکی کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے۔ امیروں کے بگڑے شہزادے..... شاید انھیں غنڈے کہنا نامناسب نہیں ہوگا۔ یہ ہمارے ملک کی بد قسمتی ہے کہ آزادی کے بعد جن نمائندوں کو لوگ چن کر قانون سازیہ میں بھیجتے رہے تا کہ وہ موجودہ اور آنے والی پیڑھیوں کی رہبری کر سکیں اور ان کے لیے موزوں قانون بنا سکیں، ان میں سے اکثر و بیشتر جرائم میں ملوث ہوتے ہیں اور وہ خود اپنے گھر میں نظم و ضبط نہیں رکھ پاتے۔ ان کی بے لگام اولاد نڈر اور دبنگ ہوتی ہے اور وہ سوچتی ہے کہ قانون ان کی کٹھ پتلی ہے۔ ان طلبہ میں سیاست دانوں کے علاوہ افسر شاہی کے بیٹے بیٹیاں بھی شامل ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھ چند ایسے طاقت ور دوستوں کو بھی رکھتے ہیں جو ہٹے کٹے ہوتے ہیں تا کہ ان کے گروہ کا دبدبہ بنا رہے۔ اس کالج میں بھی چار پانچ ایسے لڑکے من مانی کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک لڑکے کی نظر سُچیتا راٹھور پر پڑی تھی اور وہ اس کو حاصل کرنے کے لیے لگاتار کوشش میں لگا ہوا تھا لیکن سُچیتا اس کو گھاس بھی نہیں ڈالتی تھی۔ جب معاملہ اس کے ہاتھ سے نکلتا ہوا نظر آیا تو اس نے ایک روز بہانہ بنا کر بھاسکر بھاردواج کو سر راہ پکڑ لیا۔

''او مسٹر، ذرا اِدھر تو آؤ۔''

بھاسکر تھوڑا بہت نزدیک آ گیا اور کہنے لگا۔ ''جی کہیے کیا بات ہے؟''

''تمھاری ہمت کیسے ہوئی کہ ہریجن ہوکر بھی تم نے راجپوت لڑکی پر ڈورے ڈال دیے۔ تمھیں شاید اس کا انجام نہیں معلوم؟''

''وہ میری ہم جماعت ہے۔ ایک ہم جماعت کو دوست بنانا کوئی گناہ نہیں۔ ہمارا رشتہ اس سے بڑھ کر اور کچھ بھی نہیں۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ ہم نے تمھیں اکٹھے گھومتے پھرتے دیکھا ہے۔''

''ایک دوست کے ساتھ گھومنے پھرنے پر کیا پابندی ہے؟''

''تم بہت باتیں کرنے لگے ہو۔ اپنی اوقات پہچان لو اور اپنی حد میں رہو۔''

''کسی سے دوستی کرنا اور اس کی عزت کرنا کوئی غلط کام نہیں۔''

دریں اثنا غنڈہ تعیش میں آ گیا اور لاتوں اور گھونسوں سے بھاسکر کی خاطر تواضع کرنے لگا۔ بے چارہ بھاسکر تو نہایت ہی شریف اور کم گو تھا، وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اس کے چہرے اور جسم پر کئی جگہ زخم آ گئے اور وہ غش کھا کر زمین پر گر پڑا۔ اتنے میں کالج کے دیگر طلبہ پہنچ گئے اور انھوں نے بھاسکر کو اٹھا کر اسپتال پہنچا دیا جہاں اس کی مرہم پٹی کی گئی۔ ایک روز کے بعد اسے اسپتال سے چھٹی مل گئی۔ بات کالج کے پرنسپل تک پہنچ گئی۔ وہ یہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا کیا جائے؟ اُدھر پولیس کو بھی اس مار پیٹ کی اطلاع مل گئی اور انھوں نے ایف آئی آر درج کر لی مگر جونہی انھیں اصلی مجرموں کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ کس کی اولاد ہیں تو ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس پر طرّہ یہ کہ پولیس نے جب بھاسکر بھاردواج کا بیان قلم بند کیا تو اس نے کہا کہ اسے ان لڑکوں کے خلاف کوئی شکایت نہیں ہے اور وہ اس کیس کو آگے بڑھانا نہیں چاہتا۔ دراصل بھاسکر بھاردواج مہاتما گاندھی کا پیرو کار تھا اور اس کی زندگی سے کافی متاثر ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی نصابی کتابوں کے علاوہ گاندھی جی کی کتابوں کا غور سے مطالعہ کیا تھا۔ اس لیے ان کے ہی نقش قدم پر چل کر اس نے کسی کے خلاف کوئی شکایت درج نہیں کی۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ اتفاق سے یہ بھاسکر اور سُچیتا کا گریجویشن کا

تیسرا اور فائنل ائیر تھا اور اس کے بعد وہ اس کالج کو خیر باد کہنے والے تھے۔ ابھی فائنل امتحان میں تین مہینے باقی تھے۔ دونوں انہماک سے تیاری کرنے میں لگ گئے۔

اِمسال بھاسکر کے ساتھ جو سانحہ پیش آیا اس کے تار اس کی عشقیہ زندگی کے ساتھ جڑے ہوئے تھے، اس بات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا تھا۔ سُچیتا نے جب اس کے بارے میں سنا تو وہ بہت ہی خفا ہوگئی، بھاسکر کی پُرسش کرنے کے لیے اسپتال پہنچ گئی اور اس کو بھروسہ دلایا کہ وہ ہر قیمت پر اس کا ساتھ دے گی۔

بھاسکر گریجویشن کے امتحان کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ سُچیتا نے اپنی ماں سے اس بارے میں بات کی۔

''ماں، مجھے ایک لڑکے سے پیار ہوگیا ہے اور چاہتی ہوں کہ آپ لوگ بھی اس کو دیکھ لیں اور اپنی منظوری دیں۔''

''بیٹی ابھی تو تمھاری پڑھائی کے دن ہیں۔ بی اے کا امتحان دینا ہے۔ اس ٹائم تم اس جھنجھٹ میں کہاں پھنس گئی؟ یہ کام تو ہم پر ہی چھوڑ دینا تھا۔''

''ممی، ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت قریب سے جانتے ہیں۔ روزانہ ملتے ہیں۔ مجھے تو اس کا سوبھاؤ اور طور طریق بہت اچھا لگتا ہے۔ عورت ذات کی بڑی عزت کرتا ہے اور غریبوں کے لیے اس کے دل میں اتھاہ محبت ہے۔ ایسا لڑکا تو چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔''

''کیا کرتا ہے وہ؟''

''وہ میرے ساتھ ہی گریجویشن کر رہا ہے۔ آگے ایم اے کرنے کا ارادہ ہے۔ اب تک امتیازی نمبرات سے پاس ہوتا رہا ہے۔ ابھی تو روزگار ملنے میں کچھ برس لگیں گے مگر مجھے یقین ہے کہ اس کو اس معاملے میں کوئی مشکل نہیں آئے گی۔ بہت ممکن ہے کہ آئی اے ایس امتحان کی تیاری کرے گا۔''

''کیا نام ہے اس کا؟''

''بھاسکر بھاردواج۔''

''بھاردواج...؟ بھاردواج تو برہمن ہوتے ہیں مگراب نچلی ذات کے لوگوں نے بھی اپنے نام کے ساتھ بھاردواج کا لاحقہ لگانا شروع کیا ہے۔اس کی کونسی ذات ہے، بیٹی؟''

''برہمن ذات کا نہیں ہے۔ درجہ فہرست ذات کا ہے۔''

''بیٹی، پھر تو تم دونوں کا یہ رشتہ کسی کو منظور نہ ہوگا۔ پتاجی تو بالکل ہی نہیں مانیں گے۔''

''ممی آپ کوشش کر کے تو دیکھو۔ یہ بیسویں صدی ہے۔ یہ رِوایتیں تو پرانی اور فرسودہ ہو چکی ہیں۔ میرے خیال میں ایک سکھی پریوار کے لیے دونوں میاں بیوی کا ذہنی میل ہونا زیادہ ضروری ہے ورنہ زندگی برباد ہو جاتی ہے۔''

''ٹھیک ہے میں تمھارے پتاجی سے بات کروں گی۔مگر مجھے اس رشتے کے امکانات بہت کم لگ رہے ہیں۔''

ماں نے جونہی باپ سے اس بارے میں بات کی تو اس پر جیسے بجلی گر پڑی۔اس کے گماں میں بھی نہ تھا کہ اس کی بیٹی، اور وہ بھی اتنی سمجھدار اور سگھڑ بیٹی، اپنے لیے ایسا بَر ڈھونڈے گی۔اس کا پارہ ایک دم سے نقطۂ عروج تک پہنچ گیا اور وہ اونچی آواز میں چلانے لگا۔

''لگتا ہے تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔تم نے یہ بات زبان پر لائی کیسے؟ کچھ شرم بھی نہیں آئی۔ بیٹی کی محبت میں تم پاگل ہو گئی ہو۔ سارے خاندان کی عزت ڈبونا چاہتی ہو۔ کبھی سوچا بھی ہے کہ اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔ سماج ہمارا حقہ پانی بند کر دے گا۔اور ہمارے لیے زندگی گزارنا مشکل ہو گا۔''

''آپ پریشان نہ ہوں۔ میں نے سُچیتا بٹیا کو پہلے ہی تنبیہ کی ہے کہ یہ رشتہ کسی کو منظور نہیں ہوگا۔مگر پھر بھی اس نے استدعا کی کہ میں آپ سے بات کروں۔ خیر میں اسے آپ کے فیصلے کے بارے میں آگاہ کرلوں گی۔ آپ بالکل چنتا نہ کریں۔''

سُچیتا نے والدین کا فیصلہ سن لیا۔اس کو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ اس کی محبت کا کیا انجام ہوگا پھر بھی اس نے کوشش کی کہ شاید اس کی درخواست قبول ہو۔ وہ حیران تھی کہ بیسویں صدی

میں بھی ہم ذات پات کی نفرتوں کو پال رہے ہیں اور انسان کی اچھائیوں کو نظر انداز کر کے اس کی ذات کو اہمیت دیتے ہیں۔ وہ اپنے سماج سے نفرت کرنے لگی۔اس واقعے کا ایک اور نتیجہ یہ نکلا کہ سُچیتا کے والدین چوکنا ہو گئے۔ وہ اپنی بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے کی زور و شور سے تیاریاں کرنے لگے اور اپنی برادری میں لڑکا ڈھونڈنے لگے۔

اِدھر سُچیتا اور بھاسکر دونوں امتحان کے لیے خوب تیاری کر کے اس میں شریک ہو گئے اور پھر گذشتہ برسوں کی طرح ہی امتیازی نمبرات لے کر پاس ہو گئے۔اس کے بعد دونوں کے راستے الگ ہونے تھے، سو ہو کر رہ گئے۔

اپنی بیٹی کے معاشقے کے بارے میں جان کر سُچیتا کے والدین کی نیند اُڑ گئی۔سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان سے کہاں غلطی ہو گئی۔بیٹی کو پڑھانا لکھانا کوئی گناہ تو نہ تھا مگر وہ ایسا قدم اٹھائے گی اس کا گماں بھی نہ تھا۔دونوں نے آپس میں صلاح مشورہ کر کے فوراً بیٹی کی شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔اسی جلد بازی میں سُچیتا راٹھور کی منگنی کوشل ورما سے طے پائی۔لڑکے والوں کی طرف سے بھاری جہیز کی مانگ کی گئی۔رام سرن راٹھور کچھ ہی مہینوں میں ڈپٹی پوسٹ ماسٹر کے پوسٹ سے ریٹائر ہونے والے تھے۔اس نے پس سبکدوشی واپس اپنے گاؤں جا کر وہیں پر اپنی بچی کھچی زندگی بسر کرنے کی ٹھان لی تھی۔اپنے بھائی بندھوؤں اور گاؤں والوں کے ساتھ ہی گاؤں میں اپنی بیٹی کی شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔اس نے سوچا کہ ریٹائرمنٹ پر ملنے والی گریچوٹی وغیرہ سے سُچیتا کی شادی کی رسم پوری ہو جائے گی اور پھر میاں بیوی پینشن کی رقم پر گزارا کر لیں گے۔

سُچیتا نے ماں باپ کے اس فیصلے کے سامنے اپنا سر جھکایا اور عام ہندوستانی لڑکیوں کی طرح بے دلی سے اپنے ماضی کو قفل لگا کر ایک نئی زندگی جینے کا ارادہ کر لیا۔اس کا دل صبح سویرے سے ہی خون کے آنسو رو رہا تھا۔مگر ہوتا وہی ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔لڑکے والے شگون لے کر سُچیتا کے گھر آگئے۔ساتھ میں مٹھائیوں سے بھرے ہوئے بڑے بڑے تھال لائے۔ان کا استقبال بڑی دھوم دھام سے کیا گیا۔جونہی ان کے آنے کی آہٹ ہوئی سُچیتا

جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی، منہ ہاتھ دھویا، اپنے چہرے پر حسین گلال کا میک اپ چڑھایا اور لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ چپکا دی تا کہ اندر کی مایوسی ظاہر نہ ہو۔

لین دین کی باتیں کر کے دونوں سمدھیوں نے لڑکے اور لڑکی کو کمرے میں اکیلا چھوڑ دیا اور خود دوسرے کمرے میں چلے گئے تا کہ وہ آپس میں بات کر سکیں اور ایک دوسرے کو سمجھ سکیں۔ خیر سمجھنے کی بات ہی کیا تھی جب والدین کو یہ رشتہ منظور تھا، بس ایک رسم تھی جس کو نبھانا لازم تھا۔ تھوڑے وقفے کے بعد کوشل ورما نے گفتگو کا آغاز کیا جبکہ سُچیتا سمٹی سمٹائی خوبصورت ساڑھی میں ملبوس سامنے بیٹھی تھی۔

''آپ کا نام سُچیتا تو اپنی ممی سے پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے، میرا نام کوشل ورما ہے۔''

''جی میں جانتی ہوں۔ مجھے بھی والدین نے پہلے ہی بتایا ہے۔''

''آپ آج کل کیا کرتی ہیں؟''

''بی اے کا امتحان حال ہی میں دیا ہے۔ آگے کیا کرنا ہے اس کا فیصلہ شادی کے بعد ہی لیا جائے گا۔ اس میں سسرال والوں کی رضامندی بھی تو ضروری ہوگی۔''

''اوہ، میں سمجھا۔ میں نے بھی کامرس میں ڈگری حاصل کی ہے اور اب پتا جی کے ساتھ اس کا ہاتھ بٹا رہا ہوں۔ مجھے تو مزید تعلیم حاصل کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پتا جی کی بہت بڑی جاگیر ہے اور پھر اس کا کاروبار بھی بہت پھیلا ہوا ہے، اس لیے وہیں پر تجربہ حاصل کرنا زیادہ مفید ہوگا۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔ ہر کسی کا اپنا اپنا نظریہ ہوتا ہے۔''

''آپ کو گھر کے سبھی کام کاج تو آتے ہوں گے، یہی کھانا پکانا، دھونا، صفائی کرنا وغیرہ؟ مجھے اپنی ممی کے ہاتھ کا بنایا ہوا کھانا بہت پسند ہے۔ آپ آئیں گی تو چاہوں گا کہ آپ بھی ذائقہ دار کھانا بنائیں۔ اور کچھ کمی بیشی رہے تو میری ماں سے سیکھ سکتی ہیں۔''

''جی عورت کا جیون ہی کچن میں بیتتا ہے۔ وہاں سے فرار کیسا؟ کوشش کروں گی۔''

''مجھ سے کچھ پوچھنا چاہیں تو بے شک پوچھ لیجیے۔ میں حاضر ہوں۔''

''نہیں، ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں مطمئن ہوں۔''

''تو پھر میں والدین کو بلاؤں کیا؟''

''جی ہاں۔ضرور بلائیں۔''

کوشل دوسرے کمرے میں جا کر اپنے اور سُچیتا کے والدین کو بلا کر لایا۔ فریقین کو رشتہ پسند آیا، لین دین کی بات بھی طے ہوگئی اور ساتھ ہی شادی کی تاریخ ریٹائرمنٹ تاریخ کے ہفتہ بھر بعد طے کر لی گئی۔ اس کے بعد مہمان اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔

(۵)

طے شدہ تاریخ پر کوشل ورما سُچیتا کے گھر برات لے کر آیا۔ رام سرن راٹھور کچھ روز پہلے ہی ریٹائر ہو چکا تھا اور واپس اپنے گاؤں چلا آیا تھا۔ اپنے چھوٹے سے دو منزلہ مکان کی مرمت اور رنگائی پتائی کرائی تھی۔ موسم اچھا تھا اس لیے سامنے میدان میں برات کے استقبال کے لیے شامیانہ لگوایا تھا اور ان کے کھانے پینے کا انتظام بھی وہیں پر کروایا تھا۔ دُلہا گھوڑی پر چڑھ کر آیا جبکہ دوسرے مہمانوں کے لیے دو بسوں کا بندوبست کیا گیا تھا۔ اکثر و بیشتر ناچتے گاتے اور جھومتے ہوئے شامیانے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ میزبان اور اس کے رشتے داروں نے پھولوں کی مالائیں پہنا کر مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔

ماحول میں جہاں ہر طرف خوشی چھائی ہوئی تھی وہیں چند گوشوں میں منہ لٹکے ہوئے نظر آ رہے تھے حالانکہ میزبان کی جانب سے بہت کوشش کی جا رہی تھی کہ رنگ میں بھنگ نہ پڑ جائے۔ دُلہن ہونے کے باعث سُچیتا اپنے کمرے میں سہیلیوں کے ساتھ شادی کی رسم کی منتظر تھی۔ دھیرے دھیرے سارے مہمان شامیانے کے نیچے کرسیوں پر بیٹھ گئے اور انھیں کولڈ ڈرنک سے استقبال کیا جا رہا تھا۔ پھر نہ جانے یکا یک کیا ہوا۔ دونوں سمدھیوں کے بیچ شامیانے کے ایک کونے میں تکرار ہوئی جو دیکھتے ہی دیکھتے ناچاقی میں بدل گئی۔ رام سرن

راٹھور اپنے سمدھی سے بڑی منت سماجت کر رہا تھا کہ اسے مزید کچھ مہلت کی ضرورت ہے تا کہ وہ اپنا وعدہ پورا کر سکے۔ نیز اس کو یہ بھی سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے اپنے وعدے سے مکرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے مگر وہ ناگہانی قسمت کے چکر میں ایسا برا پھنس گیا ہے کہ اس وقت وہ اپنے وعدے پر عمل نہیں کر سکتا۔ وہ لگاتار بھروسہ دلانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا کہ جونہی اسے پینشن اور گریچوٹی مل جائے گی، وہ جہیز کی پائی پائی چکا دے گا۔ التجا کرتے کرتے اس نے اپنے سر سے پگڑی اتار کر سمدھی کے پیروں پر رکھ دی اور درخواست کی کہ ''اس وقت میری عزت صرف آپ کے ہاتھوں میں ہے، اسے بچایئے ورنہ میں کہیں کا نہ رہ جاؤں گا۔''
رام سرن راٹھور کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہہ رہا تھا جسے وہ روک نہیں پا رہا تھا۔

کوشل ورما کے پتا جی نے طیش میں آ کر اپنے بیٹے کو حکم دیا کہ وہ برات کو واپس لے جائے اور اب ان لوگوں کا وہاں پر ایک لمحہ بھی ٹھہرنا ممکن نہیں۔ مہمان یہ سن کر سکتے میں آ گئے۔ کیے کرائے پر پانی پھر گیا۔ چونکہ سُچیتا دلہن تھی اس لیے وہ خود باہر جا کر اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ نہیں سکتی تھی مگر لوگوں نے جو کچھ کہا اس پر یقین کرنے کے سوا اس کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

کوئی کہہ رہا تھا کہ لڑکی کے پتا جی نے وعدہ کر کے بھی عین موقعے پر جہیز دینے سے آنا کانی کر لی۔

کوئی کہہ رہا تھا کہ لڑکی شکل وصورت سے خوبصورت نہیں ہے، اس لیے دولہے نے نامنظور کر دی۔ اس سے قبل وہ باپ کی مرضی کے خلاف کچھ بول نہیں پایا تھا مگر اب وہ بغاوت پر اتر آیا۔

کوئی کہہ رہا تھا کہ لڑکے کی کسی اور کے ساتھ سانٹھ گانٹھ تھی اس لیے موقعے کی تلاش میں تھا۔ لڑکی بے چاری تو بلی کا بکرا بن کر رہ گئی۔

کوئی کہہ رہا تھا کہ شادی کے لیے کیا گیا بندوبست کوشل ورما کے پتا جی کو پسند نہیں آیا اس لیے اس نے برات واپس لینے کا حکم جاری کیا۔

غرض یہ کہ جتنے منہ اتنی باتیں۔

برات تو لوٹ گئی مگر اپنے پیچھے اُداسی اور افسردگی کا عالم چھوڑ گئی جس نے سُچیتا کے پورے کنبے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سارا گھر ماتم کدہ بن گیا اور اس تاریکی سے نکلنے کے لیے دن نہیں بلکہ مہینے لگ گئے۔

اس واقعہ کے بعد دو سال گزر گئے۔ کوشل ورما نے نزدیک ہی ایک قصبے کی امیرزادی، رجنی تومر کے ساتھ سات پھیرے لیے اور پھر ایک لڑکی کوشکی کا باپ بھی بن گیا۔ رجنی تومر شکل وصورت سے اوسط درجے کی تھی لیکن کافی دولت ساتھ لے کر آئی۔ اس نے قدم رکھتے ہی کوشل کے گھر کا حلیہ بدل ڈالا۔ درودیوار جگمگانے لگ گئے۔ پرانی چیزوں کی جگہ نئی چیزوں نے لے لی۔ کوشل کا والد زمیندار تھا اور ساہوکاری بھی کرتا تھا۔ ساہوکار تو بذاتہٖ کنجوس ہوتے ہیں، اس لیے اس کو یہ سب کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ تاہم دھیرے دھیرے سبھی اس رنگ میں رنگ گئے۔

دولت کی فراوانی کبھی کبھار انسان کو اندھا بنا دیتی ہے خاص کر جب دولت خون پسینہ بہا کر نہیں کمائی گئی ہو۔ اتفاق سے کوشل ورما کی دوستی بگڑے ہوئے مقامی رئیسوں سے ہوگئی جن کی سنگت میں وہ شراب، نشے اور جوئے کا عادی بن گیا۔ اسی وجہ سے وہ آہستہ آہستہ عرش سے فرش پر آ گیا۔ والدین تو اس دوران مرکھپ گئے لیکن بیوی سے بات بات پر اَن بن ہوجاتی اور پھر مار پیٹ کی بھی نوبت آجاتی۔ بیوی روتی بلبلاتی رہتی اور اس کے بدن پر جگہ جگہ نیل پڑ جاتے مگر کیا مجال جو کوشل ٹس سے مس ہوجاتا۔ اس نے تو بیوی کا جینا حرام کر دیا۔ بے چاری رجنی اس گھریلو تشدد سے تنگ آ گئی اور اس نے کئی بار خودکشی کرنے کی ٹھان لی مگر بیٹی کوشکی پر نظر پڑتے ہی اس کے قدم خود بہ خود رُک جاتے۔ کوشکی گو کمسن تھی مگر ماں پر ہو رہے اَتیاچار کو برداشت نہیں کر پاتی اور کونے میں جا کر زاروقطار روتی رہتی۔ گھریلو تشدّد کے یہ گھاؤ ہمیشہ کے لیے کوشکی کے ذہن پر ثبت ہوگئے۔ آخرکار کوشل ورما نے حالات کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے اور گھر بار چھوڑ کر ممبئی بھاگ گیا۔ وہاں اپنی تعلیم کے بل بوتے پر اسے ایک دُکاندار

کے پاس حساب کتاب رکھنے کا کام مل گیا اور کچھ کلومیٹر دور ایک جھگی جھونپڑی میں رہنے کو جگہ بھی ملی۔ اس طرح وہ اپنا گزر بسر کرنے لگا۔ البتہ اس کی شراب پینے کی عادت نہیں چھوٹی۔ جب سے وہ ممبئی چلا گیا اس نے اپنی بیوی اور بیٹی کی سدھ بدھ بھی نہیں لی۔ بیوی بے چاری قسطوں میں اپنا بچا کھچا سونا اور گھر کی چیزیں بیچ بیچ کر گزارہ کرتی رہی۔

(۶)

جس دن سے برات واپس چلی گئی تھی سُچیتا راٹھور فکر و تردّد کے سبب دماغی طور پر پریشان رہنے لگی۔ طرح طرح کے خیالات اس کے ذہن میں سلسلہ وار اُبھر رہے تھے جیسے بارش کے سبب پوکھر میں پانی کے بلبلے پیدا ہوتے ہیں۔ جنم لیا، چند لمحے پھولتے رہے اور جب انتہا کو پہنچے تو بے مطلب پھٹ گئے۔ سُچیتا غیر شعوری طور پر اپنے ماضی کو کھنگال رہی تھی اور زندگی کی بے ثباتی پر فکر مند تھی۔ اسے شادی کا وہ سانحہ بار بار کچوٹتا رہتا جس نے نہ صرف اس کو بلکہ سارے خاندان کو کہیں کا نہ رکھا تھا۔ وہ اپنے آپ سے بار بار پوچھتی کہ کیا اس دنیا میں لڑکی ہونا پاپ ہے، کیا اس کی زندگی صرف ایک گُڑیا کی مانند ہے جس کو اس کے مالک اپنی تفریح کے لیے چابی دے کر جیسے مرضی ویسے نچاتے ہیں۔ اس کے باوجود نہ تو وہ اپنے واالد سے ناراض تھی اور نہ ہی کوشل ورما سے۔ وقت نے کچھ عجیب سا کھیل کھیلا تھا جس کے سبب ایسا دلدوز تماشا ہو کر رہ گیا۔

یہ حقیقت ہے کہ اُس وقت قسمت نے ایسی کروٹ لی تھی کہ کوئی کچھ بھی نہ کر سکا۔ اس کے باپ رام سرن راٹھور کو، جو ہیڈ پوسٹ آفس میں بطور ڈپٹی پوسٹ ماسٹر کے کام کر رہا تھا، سرکار نے معطل کر دیا تھا۔ عین ریٹائرمنٹ سے مہینہ بھر پہلے پوسٹ آفس کے سرکاری خزانے سے غبن کا معاملہ سامنے آیا۔ حالانکہ غبن کرنے والے پوسٹل اسسٹنٹ اور اس کے شریک کاروں کی شناخت ہو چکی تھی پھر بھی چونکہ رام سرن راٹھور سے نادانستہ طور پر نگرانی کرنے میں چوک ہوئی تھی اس لیے اس کو بھی حکمِ معطلی کے ساتھ رول ۱۴ کے تحت فردِ جرم ہاتھ میں تھما دیا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ ریٹائرمنٹ کے وقت اسے ملنے والی رقم تب تک روک لی گئی جب تک اس

کے کیس کا فیصلہ نہ ہوتا۔

سرکاری دفتروں میں تادیبی کارروائی شیطان کی آنت کی طرح طول کھینچتی ہے۔ کسی کو اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ اس مخصوص جرم میں ملازم کا کیا یوگدان رہا ہے، اس کی گھر کی مالی حالت کیسی ہے یا پھر وہ گھریلو فرنٹ پر کسی طور عہد بند تو نہیں ہے؟ یہاں تو گیہوں کے ساتھ گھُن بھی پس جاتا ہے۔ افسروں کو اس بات کی چنتا نہیں ہوتی کہ دیکھ لیں آیا ہر وہ ملازم، جس پر فرد جرم دائر کیا گیا ہے، حقیقت میں غبن کرنے میں براہ راست ملوث ہے یا نہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ غریب معصوم ملازم کسی اور کی کارستانی کا شکار ہو گیا ہو؟

رام سرن راٹھور اپنی معطلی اور فرد جرم کے خلاف درخواست پر درخواست دیتا رہا مگر کہیں کوئی سنوائی نہیں ہوئی۔ اسے پوری امید تھی کہ چنانچہ اس جُرم میں اس کا کوئی رول نہیں تھا اس لیے اس کی بحالی جلدی ہو جائے گی اور اس کو ریٹائرمنٹ پر ملنے والی رقوم مل جائیں گی۔ اس لیے وہ صبر سے کام لیتا رہا۔ دماغی حالت بھی ایسی ہو گئی کہ اس نے سوچنے بھی نہ دیا کہ وہ اپنے سمدھی کو فوراً اس بات کی اطلاع دے۔ آخر بیٹی اور پھر سارے خاندان کی عزت کا معاملہ تھا۔ اسے امید تھی کہ شادی کے روز وہ سمدھی کو اعتماد میں لے گا اور خود پر ناگاہ آئی آفت سے آگاہ کرے گا۔ ساتھ ہی اسے یقین دلائے گا کہ سرکار سے رقوم ملتے ہی وہ ساری رقم اس کے سامنے رکھ دے گا۔ آخر سُچیتا اس کی اکلوتی بیٹی ہے، اس کی جائیداد پر تو اسی کا حق بنتا تھا، آج لے جائے یا بعد میں۔

کوشل ورما کے والد کو رام سرن کے معطل ہونے کی خبر پہلے ہی مل گئی تھی تاہم اس نے سوچا کہ بندہ اچھی پوسٹ پر مقرر تھا اور ڈاک خانے میں کئی دہائیوں تک کام کرتا رہا، اس لیے عمر بھر خطیر رقم جمع کی ہوگی ورنہ جہیز دینے کا وعدہ کیوں کرتا؟ یہی سوچ کر وہ مقررہ دن پر کوشل کی برات لے کر راٹھور ڈیوڑھی پر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر دم لے کر اس نے سب سے پہلی بات جہیز ہی کی کر لی۔ اس کے پاؤں تلے کی زمین سرک گئی جب اسے پتہ چلا کہ رام سرن راٹھور اس قابل نہیں ہے کہ وہ فی الحال جہیز دے سکے کیونکہ اس کو ریٹائرمنٹ کی رقومات ابھی تک

نہیں مل پائی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ سُچیتا رام سرن کی اکلوتی بیٹی تھی مگر اس کے دل میں خدشہ پیدا ہوا کہ اگر شادی کی رسم مکمل ہو گئی تو کون جانے بعد میں اس کا سمدھی اپنا وعدہ پورا کرے گا بھی یا نہیں۔ انسان کا کیا بھروسہ، کب نیت بدل جائے کوئی کہہ نہیں سکتا۔ ایسا خیال اس کے ذہن میں اس لیے بھی پیدا ہوا کیونکہ وہ نہ صرف زمیندار تھا بلکہ ساہوکار بھی تھا اور ساہوکار کسی کا سگا نہیں ہوتا۔ مایوس ہو کر اس نے اپنے بیٹے کو حکم دیا کہ وہ اپنی گھوڑی کا رخ واپس موڑ لے اور اس طرح برات دروازے سے ہی لوٹ گئی۔

رام سرن راٹھور ڈیوڑھی کے پاس ہی گر پڑا اور قلب کا دائمی مریض بن گیا۔ اُدھر گھر کے اندر سُچیتا کی ماں کو بھی غش آ گیا۔ شادی میں آئے مہمان کھسر پھسر کرنے لگے۔ برات کے لیے بنائی گئی سبھی ضیافتیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ کچھ مہمان کوشل کے پتاجی کی بے رحمی پر تھوتھو کرنے لگے لیکن اکثر مہمانوں نے سُچیتا کے پتاجی کو ہی موردِ الزام ٹھہرایا۔ ان کا یہ ماننا تھا کہ رام سرن کو برات آنے سے قبل ہی اپنی پوزیشن کے بارے میں صاف بیانی سے کام لینا چاہیے تھا اور اگر لڑکے والے کو منظور نہ ہوتا تو شادی ملتوی کر دیتا یا پھر منسوخ کر دیتا۔ اتنی ذلت وخواری کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ بات دو خاندانوں کے بیچ میں رہتی، سرعام خجالت تو نہ ہوتی۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ رام سرن نے بروقت اپنے تاش کے سارے پتے سمدھی کے سامنے نہیں کھولے تھے اور اس کو اندھیرے میں رکھا تھا جس کی وجہ سے سمدھی کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ رام سرن لوگوں کی ان آرا سے بہت افسردہ ہو گیا اور اس سانحے کے بعد زیادہ دیر نہیں جی سکا۔ اس کے بعد ہی اس کی بیوی بھی سورگباش ہو گئی کیونکہ وہ بھی اس شرمندگی اور ذِلّت کو برداشت نہ کر سکی۔

اِدھر کوشل ورما کی برات واپس چلی گئی اور اُدھر سُچیتا کے دوست بھاسکر بھاردواج نے امتیازی نمبروں کے ساتھ گریجویشن مکمل کر کے آگے تعلیم حاصل کرنے کی سعی کر لی۔ وہ اقتصادیات کا طالب علم تھا اور اسی میں آگے پڑھائی کرنا چاہتا تھا۔ اس کے پاس کیرئر بنانے کے لیے دو راستے تھے۔ ایک، پوسٹ گریجویشن کرنے کے ساتھ ساتھ آئی اے ایس کی تیاری

کرنا یا پھر ایم اے کر کے ایم بی اے کی ڈگری حاصل کرنا۔اس کے بعد وہ بزنس میں اپنا کیرئر بنا سکتا تھا۔ پہلی صورت میں اس کو ریزرویشن کا فائدہ مل جاتا مگر خود اعتمادی کے سبب اس نے اس خیال کو سرے ہی سے ٹھکرا دیا اور محنت و مشقت کر کے پہلے اقتصادیات میں ایم اے اور پھر آئی آئی ایم احمد آباد سے ایم بی اے کامیاب کیا۔

سُچیتا کے والدین کے گزر جانے کے سبب اس کا گھر خالی اور سنسان ہو گیا اور اس دنیا سے جوجھنے کے لیے وہ تنہا رہ گئی۔ برات تو خیر واپس چلی گئی لیکن سُچیتا نے زندگی کا ایک بہت بڑا فیصلہ لے لیا اور وہ تھا عمر بھر کنواری رہنا۔

(۷)

سُچیتا راٹھور نے ہمت جٹا کر اپنی تعلیم جاری رکھی۔ بی اے تو پہلے ہی کامیاب کر چکی تھی پھر شہر جا کر ایم اے (سوشولوجی) اور ایم فِل کی ڈگریاں حاصل کر لیں۔اس کے بعد وہ ایک پرائیوٹ اسکول میں بطور استانی مقرر ہوئی۔ اپنی کامیابی کو دیکھ کر وہ بہت ہی خوش تھی اور بڑے عزم کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔

کئی برسوں کے بعد اس کے آنجہانی پتا جی کا کیس انجام کو پہنچا۔ چنانچہ جرم میں اس کی کوئی بالراست وابستگی نہ تھی اور انضباطی کارروائی کے دوران اس کی موت واقع ہوئی تھی اس لیے مرحوم پر کوئی سزا عاید نہیں کی گئی۔ اُس کے پنشن کی بقایا جات رقم، گریچوٹی اور دیگر رقومات بیٹی کو ادا کر دی گئیں۔ سُچیتا نے پوری رقم فی الحال بنک میں جمع کر دی۔ تاہم وہ تردّد میں پڑ گئی کہ وہ اتنی خطیر رقم کا کیا کرے گی؟ وہ جلدی میں کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتی تھی۔ اس نے یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کا داخلہ لیا اور ریسرچ مقالے 'بدلتی سماجی اخلاقیات اور ہندوستانی عورت' کی تیاری میں بڑی لگن کے ساتھ جٹ گئی۔ گاہے بہ گاہے وہ سوچتی رہتی کہ پتا جی کی چھوڑی ہوئی رقم اور جائیداد کا کس طرح جائز استعمال کیا جا سکے۔

پی ایچ ڈی کی تعلیم کے دوران سُچیتا نے مقامی یتیم خانے سے دو کمسن لڑکیوں کو، جن کا اس دنیا میں کوئی آسرا نہ تھا، گود لیا اور ان کو پالنے لگی۔ ان کے نام بدل کر ایک کا وِدوشی اور دوسری کا میترئی رکھا۔ وِدوشی چار برس کی تھی اور میترئی تین برس کی۔ اس طرح اس نے مجرد مادریت (Single parenting) کا بیڑا اٹھالیا اور یہ ذمہ داری بڑی خوبی سے نبھائی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کو ہوسٹل سے کرائے کے فلیٹ میں منتقل ہونا پڑا۔ تین سال کے بعد اس کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل گئی جبکہ دوسری جانب اس کی لے پالک بیٹیاں باضابطہ اسکول جانے لگی تھیں۔ ان لڑکیوں کی دیکھ بھال کرنے میں اس کو بڑی مسرت محسوس ہو رہی تھی اور اسے کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ مجرد مادریت کے اس تجربے کی کامیابی نے اس کے ذہن کو متحرک کر دیا اور وہ اس سمت میں نئی اڑانیں بھرنے کے لیے خود کو آمادہ کرنے لگی۔

اس درمیان سُچیتا راٹھور نے جمع شدہ رقم سے کچھ حصہ نکال کر اپنے پشتینی گاؤں میں ایک پرسکون سی جگہ ڈھونڈ لی اور وہاں پر زمین کا ایک بڑا سا ٹکڑا خرید لیا۔ پھر وراثت میں ملی زرعی زمین اور آبائی مکان بیچ کر اس زمین پر یتیم خانہ کے لیے دو منزلہ مکان کھڑا کر دیا جس میں بچوں کے رہنے کے لیے الگ کمرے، بیت الخلا اور غسل خانے بنوائے گئے۔ اپنی رہائش اور لڑکیوں کے لیے اوپر والی منزل مختص کی گئی جبکہ دفتر کے لیے پہلی منزل پر ہی دو کمروں کی نشاندہی کی گئی۔ علاوہ ازیں بچوں کے لیے کھیل کود کا انتظام بھی کیا گیا۔ شہر سے دور گاؤں ہونے کے سبب لاگت زیادہ نہیں آئی۔ غرضیکہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری لیتے ہی سُچیتا راٹھور اس مکان میں منتقل ہو گئی اور اس کے بعد آٹھوں پہر یتیم خانہ میں دستیاب رہتی۔ باقی ماندہ رقم اس نے یتیم خانے کی آئندہ توسیع اور روزمرہ اخراجات کے لیے پسِ انداز کر لی۔ اس کام میں مانسی موسی نے بھی رضاکارانہ طور پر اس کا ہاتھ بٹانے کے لیے ہامی بھر لی اور دونوں یتیم خانے ہی میں اقامت کرنے لگیں۔ اس کے ساتھ ساتھ سُچیتا نے ایک غیر سرکاری تنظیم (NGO) کی بنیاد ڈالی اور یتیم خانہ سمیت دونوں کی رجسٹریشن کے لیے دوڑ دھوپ کی۔ مدعا یہ تھا کہ این جی او کی منظوری مل کر مختلف ذرائع سے امداد ملنے کے دروازے کھل جاتے۔ یتیم خانے کا نام

'وِردان اناتھ آشرم' رکھا گیا اور اس کی افتتاحی رسم ریاستی سرکار کے ایک نیک اور مقبول وزیر کے دستِ مبارک سے انجام دی گئی۔ ریاستی سرکار کی جانب سے بھی اس کارِ خیر کے لیے کچھ سرمایہ بطور خیرات دیا گیا جس کے لیے سُچیتا نے مہمانِ خصوصی کا شکریہ ادا کیا۔

رفتہ رفتہ کئی بچوں کو اس آشرم میں داخل کیا گیا اور چند ہی برسوں میں ان کی تعداد بیس تک پہنچ گئی۔ آشرم کے صدر دروازے پر ایک کھٹولا لٹکایا گیا جس میں غیر شادی شدہ یا مصیبت زدہ مائیں اپنے نوزائدہ بچوں کو چھوڑ کر جاتی تھیں تا کہ ان کی پہچان مخفی رہے۔ البتہ پولیس کو اس آمد کی خبر دینا ضروری تھا تا کہ کل کو کوئی پریشانی نہ ہو۔ ان لاوارث بچوں کا نام رکھنے کا عمل یتیم خانے ہی میں انجام دیا جاتا۔ بہر حال یہ جاننا مشکل تھا کہ ان کا مذہب یا ذات کیا ہے۔ تاہم جو بچہ قدرے بڑا ہوتا اور جسے کوئی شخص خود پر آئی کسی آفت کے سبب ذاتی طور پر یتیم خانے میں بھرتی کراتا، اس کو بچے کا اصلی نام لکھوانا پڑتا اور وہی نام آگے بھی جاری رہتا۔ سُچیتا نے آشرم میں سبھی فرقوں کے تہوار منانے کی رسم قائم کی اور ان تقریبات میں سبھی بچے شریک ہو جاتے۔ شروعات رام بھجن سے ہوتی۔ "ایشور اللہ تیرو نام، سب کو سنمتی دے بھگوان، رگھو پتی راگھو راجہ رام، پتت پاون سیتا رام....." سُچیتا راٹھور کے گماں میں بھی نہ تھا کہ اس کا یہ پروجیکٹ اتنا کامیاب رہے گا۔ اب تو اسے پل بھر کی فرصت بھی نہیں ملتی تھی اور نیند تو وہ برائے نام ہی کرتی تھی۔ یتیم خانے کی حفاظت، صفائی ستھرائی، اشیائے خوردنی کی خرید اور بچوں کی بنیادی تعلیم کا انتظام۔ ان سب کاموں کی نگرانی سُچیتا خود ہی کرتی اور بارہا نسی موسی کی مدد بھی لیتی۔ وقت گزرنے کے ساتھ سُچیتا نے ان کاموں کے لیے چند لازمی ملازموں کی تقرری کی جن میں زیادہ تر ٹھکرائی ہوئی تعلیم یافتہ عورتیں اور بیوائیں تھیں جو خود زندگی کے مصائب کا سامنا کر چکی تھیں۔ انھیں اس بات کا احساس ہوتا کہ زندگی کتنی قیمتی ہے اور خود کفیلی کتنی اہم ہے۔ ان میں ایسی کوئی بھی عورت نہ تھی جو بے دلی سے کام کرتی۔ عام طور پر وہ صبر و تحمل سے بچوں کی پرورش کرتیں اور سُچیتا کو اپنے خوابوں کی تعبیر پانے میں مدد کرتیں۔

اَناتھ آشرم کو کھلے ابھی ایک برس بھی نہیں ہوا تھا کہ نزدیک کے ایک گاؤں پر ہلادپور میں زبردست زلزلہ آیا۔ حالانکہ زلزلے سے کئی گاؤں متاثر ہوئے مگر پر ہلادپور میں سب سے زیادہ نقصان ہوا۔ زلزلہ کیا تھا ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ قیامت آ گئی۔ کتوں کو تو زلزلے کی آہٹ پہلے ہی سے آتی ہے، وہ یکایک بھونکنے اور جھنکنے لگے۔ دھرتی، عمارتیں، پیڑ پودے سب لرز اٹھے۔ زمین پر کئی جگہ دراڑیں پڑ گئیں۔ مویشی بے تحاشہ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ جتنے بھی کچے پکّے مکانات تھے ایک کے بعد ایک گرتے چلے گئے۔ ہر طرف دھول ہی دھول نظر آ رہی تھی۔ لوگ دوڑتے ہوئے اپنے گھروں سے باہر آ کر جمع ہو گئے۔ بہت سارے لوگ گرتی چھتوں اور دیواروں کے سبب لقمۂ اجل ہو گئے البتہ جو ملبے کے نیچے دبے ہوئے تھے ان کی چیخیں ہر طرف سنائی دے رہی تھیں مگر ان کو بچانے والا کوئی نہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا گاؤں اجڑ گیا۔

رجنی ورما گھر میں اپنی بیٹی کوشِکی کے لیے فراک سِل رہی تھی کہ ایک دھماکہ ہوا اور گھر کی چھت اس کے سر پر آ گری۔ اس کی بیٹی کوشِکی آنگن میں کھیل رہی تھی، وہ ماں کی چیخ سن کر دوڑ پڑی اور وہاں اپنی ماں کو ملبے کے نیچے تڑپتے دیکھ لیا۔ جلدی سے باہر نکلی اور وہاں پر کھڑے پڑوسیوں سے التجا کرنے لگی۔ اس سمئے تک گاؤں کے کچھ نوجوانوں نے کمر کس لی تھی اور وہ زخمی ہوئے لوگوں کو گھروں سے بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کوشِکی نے رو رو کر ان سے بھی التجا کی۔ انھوں نے وقت ضائع کیے بغیر رجنی ورما کو ملبے کے نیچے سے نکالا اور تُرنت اسپتال پہنچا دیا۔ کوشِکی بھی ان کے ساتھ ہی چلی گئی۔ ڈاکٹروں نے اس کی ماں کو بچانے کی حتی المقدور کوشش کی مگر ناکام رہے۔ پھر رضا کار لاش کو کفن میں لپیٹ کر آخری رسومات کے لیے لے گئے۔ کوشِکی ان کو دیکھتی رہ گئی۔ رضا کاروں نے اس کو ساتھ آنے سے منع کر دیا۔ اس لیے وہیں اسپتال کی سیڑھیوں پر روتی بسورتی رہ گئی۔

مانسی موسی نے اسی اسپتال کی سیڑھیوں پر اس ننھی بے سہارا بچّی کو دیکھ لیا۔ لڑکی مسلسل

آنسو بہائے چلی جارہی تھی اور منہ سے صرف 'ماں، ماں' کے الفاظ بول رہی تھی۔ موسی کوشِکی کو پچکارنے اور تسلی دینے لگی۔ اسے رونے کا سبب پوچھنے لگی، پھر دائیں بائیں جتنے بھی لوگ ملے ان سے پوچھ پچھ کی اور آخر کار اسپتال کے رجسٹریشن کلرک سے رابطہ کیا، اس نے بتایا کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ کچھ رضا کاروں نے اس کی ماں کو لایا تھا مگر سب واپس چلے گئے۔ اس کا کوئی رشتے دار اب تک اس کو ڈھونڈنے نہیں آیا۔ موسی نے اس کو گودی میں اٹھا کر اپنے ساتھ لیا اور دیدی کے حوالے کر دیا۔ اس کو آشرم میں بھرتی کر دیا گیا جہاں دوسرے بچوں کے ساتھ اس کی پرورش ہونے لگی۔

کوشِکی کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ عمر تھی ہی کتنی کہ حالات کو سمجھ پاتی۔ اس کے لیے آشرم میں دوسرے یتیم بچوں کے ساتھ رہنا ایک عجیب سا تجربہ تھا۔ نہ کہیں ماں کا پتہ اور نہ کہیں باپ کا۔ وہ گھر کی گرماہٹ بھی غائب تھی۔ اس سے بھی بڑی بات یہ تھی کہ نہ ماں کی طرف سے اور نہ ہی باپ کی طرف سے کوئی رشتے دار اس کو ڈھونڈنے کے لیے وہاں یا پولیس اسٹیشن آیا۔ سُچیتا اور موسی کی محبتیں ماں باپ کی کمی کو پورا نہیں کر سکتی تھیں۔ کوشِکی دن بھر روتی جبکہ وہاں کے ملازمین اس کو دلاسہ دیتے رہتے۔ آہستہ آہستہ اس نے ماحول کے ساتھ مناسبت پیدا کر لی اور وہاں کے دستور کے مطابق خود کو ڈھالنے لگی۔

(۹)

ابھی وَردان اَناتھ آشرم ابتدائی مسائل اور مشکلات سے جوجھ ہی رہا تھا کہ بھوانی پور گاؤں اور اس کے گردونواح میں قدرت نے اپنا قہر ڈھا دیا۔ تین سال مسلسل سوکھا پڑا، کہیں کوئی بارش کی بوند بھی نہ گری اور نہ ہی آسمان پر بادل نظر آئے جس کے باعث زمین پاپڑ کی طرح نظر آنے لگی۔ لوگ قحط سے جوجھتے جوجھتے نڈھال ہو گئے۔ کسانوں کے پاس جینے کے لیے مٹھی بھر اناج تک باقی نہ رہا۔ جو بھی کچھ پسِ انداز کی ہوئی پونجی یا اناج کا ذخیرہ تھا وہ سب

دھیرے دھیرے سوکھے کی نذر ہو گیا۔ دراصل اس علاقے پر ہیبت ناک ہندوستانی صحرا، تھَر، کا سایہ پڑا ہوا ہے جو بقول ماہرین مشرق کی جانب بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔

خشک سالی اور سیلاب دو ایسی قدرتی آفتیں ہیں جن سے روزمرہ کی زندگی تہس نہس ہو جاتی ہے۔ چونکہ ملک کا بیشتر حصہ مون سون پر منحصر ہے اس لیے کسان سال بھر بارش کے انتظار میں بیٹھا رہتا ہے۔ سوچتا ہے کہ برسات کا موسم آئے گا، وہ بیج بوئے گا اور پھر اس کی دیکھ بھال کر کے آخر کار اپنی محنت کا پھل کاشت کرے گا۔ مگر کبھی کبھی کسی علاقے میں دہقانوں کا یہ انتظار طول کھینچتا چلا جاتا ہے اور زمین پر سوکھے کے باعث کہیں بھی ہریالی نظر نہیں آتی ہے۔ دور دور تک گھاس کا ایک بھی پتہ دکھائی نہیں دیتا۔ نتیجتاً کسان پژمردہ، بے حال اور بے بال و پر ہو جاتا ہے۔ سرمایے کی کمی اور قرض کے بوجھ سے وہ اتنا دب جاتا ہے کہ بعض اوقات بیگار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے یا پھر زمین بیچ کر شہر میں مزدوری کرنے چلا جاتا ہے۔ لوگ پانی کی بوند بوند کے لیے ترستے ہیں۔ کھیتوں میں مویشیوں کے چلتے پھرتے پنجر پانی کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں اور جو مویشی مر جاتے ہیں ان کے ڈھانچے کھیتوں میں جا بجا بکھرے پڑے نظر آتے ہیں۔

کاشتکار کی کسمپرسی کے اہم اسباب غیر متوقع موسمی تبدیلیاں ہیں مثلاً قحط، سیلاب، آندھی، طوفان وغیرہ۔ یہ سماوی آفتیں ہیں جن پر کسی کا کوئی کنٹرول نہیں ہے۔ ان کے علاوہ کچھ ارضی آفتیں ہیں جو انسان نے خود ہی پیدا کر لی ہیں۔ ہمارے ملک میں زیادہ تر چھوٹے اور حاشیے کے کسان ہیں کیونکہ زمینیں وراثت کے سبب بٹتی چلی جاتی ہیں جس کی وجہ سے ارضی ملکیت کم سے کم تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ ان چھوٹی زمینوں میں ٹریکٹر اور خودکار مشینیں استعمال کرنا مشکل ہوتا ہے۔ زراعت کے لیے آج بھی روایتی طریقے اپنائے جاتے ہیں۔ موجودہ دور میں بھی سینچائی، بوائی، جُتائی، کٹائی اور غلہ گاہنے کے پرانے طریقے استعمال ہوتے ہیں۔ کسان نہ تو نئی موڈرن مشینوں کو استعمال میں لاتا ہے اور نہ ہی تازہ کھیتی باڑی کے طریقوں اور نئی تکنیک و ٹکنالوجی کو اپناتا ہے۔ انجام کار ہماری دھرتی کی پیداواریت ترقی یافتہ ممالک کے

مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔اس کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ چھوٹے اور درمیانی کسانوں کے پاس اتنا سرمایہ دستیاب نہیں ہوتا کہ وہ ان نئے طریقوں کو بروئے کار لائیں۔ جب پیداوار پک کر تیار ہوتی ہے تو اس کی نہ صرف مارکیٹنگ بلکہ بازار تک نقل وحمل کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔اس پر مصیبت یہ کہ قیمتوں کا اتار چڑھاؤ اکثر وبیشتر کسان کے حق میں نہیں ہوتا۔چنانچہ اناج خاص کر میوہ جات اور سبزیوں کے گوداموں میں ذخیرہ کاری کے لیے کوئی بندوبست نہیں ہوتا قریباً پندرہ فیصد جلدی تلف ہونے والی پیداوار ضائع ہو جاتی ہے۔اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے والے بچولیے کسانوں کا خوب استحصال کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ملک میں آدھے سے زیادہ زمین بارش پر منحصر ہے۔زمین کی آبپاشی کی صحیح سہولیات میسر نہ ہونے کے سبب کسان اکثر زیر زمین پانی کے وسائل کا بے تحاشہ استعمال کرتا ہے۔اس پر طرّہ یہ کہ نامیاتی کے بدلے کیمیائی کھادوں کا بے دھڑک استعمال اور تُراب یا نباتی مٹی (Humus) کی غیر موجودگی مٹی کی زرخیزی کو کم سے کم تر کر دیتی ہے۔سرکار نے آج تک زراعت میں ریسرچ اور ڈیولپمنٹ کے لیے اتنی سرمایہ کاری نہیں کی ہے جتنی کہ ہونی چاہیے تھی۔اس کے علاوہ کسانوں کی ناخواندگی، تربیت کی کمی، مویشیوں کی صحیح دیکھ بھال نہ ہونا، اناج وغیرہ پر پھیلتی بیماریوں کا تدارک نہ کرنا اور فصل بیمہ کی عدم دستیابی وغیرہ کے باعث بھی فصل کی پیداواریت پر گہرا اثر پڑتا ہے۔

ہمارے ملک کے شمال مغرب میں صحرائے تھر ہے جو مکمل ریگستانی علاقہ ہے۔اس کا ستّر سے زیادہ فیصد حصہ راجستھان میں ہے جبکہ باقی ماندہ حصہ پاکستان میں ہے۔اس صحرا کے شمال میں ستلج دریا بہتا ہے، مشرق میں اراولی کی پہاڑیاں ہیں اور جنوب میں رن آف کچھ کا دلدل ہے۔راجستھان کے علاوہ اس نے ہریانہ، پنجاب اور شمالی گجرات کو بھی کچھ حد تک اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔حیرانی کی بات یہ ہے کہ دنیا میں اس صحرا میں رہنے والوں کا گھنا پن سب سے زیادہ ہے۔ریگستان عام طور پر قدرتی خاص کر موسمی وجوہات سے بنتے ہیں لیکن حال ہی میں دیکھا گیا ہے کہ انسانی دخل اندازی سے بھی اس میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔بقول

ماہرین تھر ریگستان وقت کے ساتھ بڑھتا چلا جارہا ہے اور اگر اس کا تدارک نہیں کیا جائے گا تو بہت ہی خطرناک صورت حال سے دوچار ہونا پڑے گا۔

خشک سالی کی گھناونی حالت میں بھوک مری اور ہجرتوں کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ کسان خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لوگ بھوک مٹانے کے لیے اپنے بچوں تک کا سودا کرنے سے نہیں جھجکتے۔ کئی ادھ مری سوکھی سڑی دوشیزائیں بھڑووں کے ہتھے چڑھ جاتی ہیں اور پھر ریڈ لائٹ ایریا کے کوٹھوں پر لٹکی نظر آتی ہیں۔ لڑکے مالی حالت سے تنگ آکر شہروں میں مزدوری کرنے چلے جاتے ہیں اور وہاں مستاجروں کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ ٹھیکیدار جتنا روزینہ دیتے ہیں مجبوراً قبول کرتے ہیں اور اسی کم اجرت سے جیسے تیسے زندگی بسر کرتے ہیں۔ کم سے کم اجرت قانون پر عمل ہوتا ہے یا نہیں، معائنہ کرنے والے سرکاری ناظر اپنی جیبیں گرم کر کے آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ البتہ سبھی اتنے خوش نصیب نہیں ہوتے کہ جلدی سے کام پانے میں کامیاب ہو سکیں، ان میں سے بیشتر چوری چکاری، جیب کترائی اور دیگر غیر قانونی کاموں کے دلدل میں پھنس جاتے ہیں اور کچھ تو مستقل طور پر مافیا کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔

قدرت کے کھیل بھی نرالے ہیں۔ جس سال بارشیں برستی ہیں، اکثر و بیشتر کسانوں کو سیلاب کا قہر جھیلنا پڑتا ہے۔ بویا ہوا بیج پانی کے ریلوں کے ساتھ بہہ جاتا ہے۔ غریب دہقانوں کو نیا بیج خریدنے یا پھر سیلاب کے ختم ہوتے ہی کھیتوں کو زرخیز بنانے کی خاطر کیمیائی کھاد خریدنے کے لیے قرضہ لینا پڑتا ہے۔ سرکاری بنکوں سے قرضہ لینا بہت دشوار ہوتا ہے۔ اگر مل بھی جائے تو بچولیے کمیشن کے طور پر قرضے کی بندر بانٹ کرتے ہیں۔ اس لیے کسان بے چارہ سود خوروں کے قرضے کے کبھی نہ ختم ہونے والے جال میں پھنس جاتا ہے۔ یہی وجوہات ہیں کہ ہندوستانی مزارع اپنی بدنصیبی پر ہمیشہ روتا ہے اور اس کی کوئی نہیں سنتا، نہ صارف اور نہ ہی سرکار۔

ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر سُچیتا راٹھور نے اپنے ہی آبائی گاؤں بھوانی پور میں ایک یتیم خانہ کھولا تھا اور اس کی دیکھ ریکھ کے لیے خود بھی وہاں رہتی تھی۔ وَرِدان اَناتھ آشرم میں کئی بچے پل رہے تھے جن کی وہاں پر نہ صرف پرورش ہورہی تھی بلکہ ان کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ ایسے آشرم کو چلانا جان جوکھم کا کام تھا اور سُچیتا اس کام کو بخوبی نبھارہی تھی۔

شومئی قسمت کہ اس گاؤں اور پاس پڑوس کے کئی گاؤں میں تین سال سے لگاتار سوکھا پڑ گیا جس کے سبب ہر طرف بربادی اور ویرانی چھا گئی۔ ماضی میں ایسی خشک سالی کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ سبھی لوگ دانے دانے کو محتاج ہو گئے۔ جس کے پاس جو کچھ بھی تھا سب قحط کی نذر ہو گیا۔ سوکھے کے باعث اس علاقے کے بسکینوں میں دہشت پھیل گئی۔ نحیف اور نادار لوگ، جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، بوڑھے بھی تھے اور بچے بھی، پیوند خاک ہو گئے۔ کہتے ہیں تھکا اونٹ سرائے کو دیکھتا ہے۔ سیکڑوں لوگ جستہ جستہ ہجرت کر کے شہر کی جانب کوچ کر گئے اور وہاں بلڈنگ ٹھیکیداروں اور دوسرے مستاجروں کے تحت کم مزدوری پر کام کرنے کو تیار ہو گئے۔ مستاجران کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر ان سے دن رات محنت کراتے اور وہ چوں تک نہیں کر پاتے۔ بے ہنر مرد، عورتیں اور کم سن بچے مٹی کھودنے، اینٹیں ڈھونے اور کنکریٹ بنانے جیسے کاموں میں لگ گئے جبکہ ہنر مند کاریگر، بڑھئی، راج مستری، آہنگر وغیرہ کو ان کے ہنر کے مطابق کام ملتا رہا۔ کبھی کوئی سرکاری افسر معائنہ کرنے آتا تو مزدوروں کو اپنی اجرت کے بارے میں جھوٹ بولنا پڑتا اور افسر مطمئن ہو کر اور اپنی جیب گرم کر کے لوٹ جاتا۔

کہیں کہیں ایسا بھی ہوا کہ گھر میں عورت یا مرد میں سے ایک شدید بیمار تھا اس لیے کوئی بھی گاؤں کے باہر قدم نہ رکھ سکا۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ تو تھا نہیں اس لیے پاس پڑوس کی بستیوں میں بھیک مانگنے کے بغیر اور کوئی چارہ نہ تھا۔ کسی کنبے میں شوہر اور بیوی دونوں موذی بیماری میں مبتلا ہو کر رحمت حق ہو گئے اور ان کے بچے بے سہارا ہو گئے۔ ان کی کوئی دیکھ بھال

نہ کر سکا اس لیے وہ بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے اور اکثر و بیشتر شاطروں کے چنگل میں پھنس گئے۔ شہر سے آئے ہوئے جسم کے دلالوں کی چاندی ہوگئی۔ انھوں نے گاؤں سے کمسن لڑکیاں اور لڑکے خرید کر ان کوٹھکانے لگایا اور اپنی تجوریاں بھرلیں۔

اکال سے متاثرہ گاؤں کی حالت نے سُچیتا راٹھور کی آنکھیں کھول دیں۔اس کا نہ صرف گاؤں متاثر ہو چکا تھا بلکہ گاؤں میں کھولے آشرم کو چلانا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ وہ بھی ایک کسان کی بیٹی تھی جس کو قسمت نے یاوری کی تھی کیونکہ اس کے والد کی سرکاری نوکری میں تقرری ہوئی تھی اور وہ شہر میں منتقل ہو گئے تھے جس کے سبب وہ پڑھ لکھ کر ڈاکٹریٹ سے مستفیض ہوگئی۔ چنانچہ وہ حساس عورت تھی اور سماج کے تئیں اپنا فرض سمجھتی تھی اس لیے وہ فکر مند ہوگئی کہ اس صورت حال کا کوئی تو حل ڈھونڈنا پڑے گا اور اس انخلا کو کسی بھی طرح روکنا پڑے گا۔ جہاں تک ممکن ہوسکتا تھا وہ بے گھر ہوئے مہاجروں کو واپس اپنے گاؤں میں آباد کرنا چاہتی تھی۔اس مسئلے کا ایک ہی حل نظر آرہا تھا اور وہ تھا گاؤں کی عورتوں کو بیدار کرنا اور کسانی کے ساتھ ساتھ روزگار کے کچھ اور وسیلے اپنانا جسے ان کی آمدنی ممکن ہو اور وہ اپنی گزر بسر کرسکیں۔

تعلیم کے دوران اور اس کے بعد بھی اسے نامور ہستیوں کی سوانح حیات کا مطالعہ کرنے کا شوق تھا۔ابراہیم لنکن، مہاتما گاندھی، نیلسن منڈیلا، فلورنس نائٹنگیل، مادام کیوری اور جون آف آرک کی زندگیوں نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔انہی ہستیوں میں مدر ٹیریسا بھی تھی جس کی زندگی سے اس کو خصوصی طور پر تحریک ملی۔ مدر ٹریسا نے کس طرح کولکتہ میں غریب نادار بچوں، جن میں لاوارث، کوڑھ اور ایڈز کی بیماری میں مبتلا بچے بھی تھے اور ذہنی طور پر معذور، رفیوجی اور جسم فروش خواتین کی دیکھ بھال کی، وہ جگ ظاہر ہے۔اس کی تنظیم 'مشنریز آف چیریٹی' کا اصول 'غریب سے غریب تر بچوں کو دل کھول کر امداد بہم پہنچانا' سُچیتا کے دل پر نقش ہوگیا۔اس نے ہمت سے کام لیا۔موجودہ حالات کو دیکھ کر اس کو سماجی بہبود کا کام کرنے کی تحریک مل گئی۔متعلقہ گاؤں کے کئی یتیم بچوں کو اکٹھا کر کے اس نے اپنے اناتھ آشرم میں پناہ

دی جہاں ان کی پرورش کا انتظام کیا گیا۔ مدر ٹریسا کی اتباع میں ہی اس نے جیسے بھی اور جہاں سے بھی ہو سکا سرمایہ اکٹھا کر لیا تا کہ اس کی مہم کو کسی رکاوٹ کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ اس نے خود جا کر سرمایہ داروں اور ایثار پسند رئیسوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور سوکھے سے متاثرہ لوگوں کی زندگیاں بچانے کے لیے امداد مانگی۔ جب وہ بچ جاتے تبھی تو ان کی باز آبادکاری ممکن تھی۔ ان کو از سر نو آباد کرنے کے لیے اس نے کئی ٹھوس اقدامات اٹھائے۔

اطمینان کی بات یہ تھی کہ کچھ بے سہارا خواتین نے بغیر کسی شرط کے سُچیتا راٹھور کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ حالانکہ عمر میں سُچیتا ان سے چھوٹی تھی پھر بھی ان کے لیے وہ 'سُچیتا دیدی' بن گئی۔ اس دوران وَردان اَناتھ آشرم میں مکینوں کی تعداد بہت بڑھ گئی اس لیے وہاں کی سہولیاتِ اساسی کی توسیع دینے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

باز آبادکاری کے کام میں جو مشکلیں آڑے آ رہی تھیں وہ تھیں سرمائے اور وسائل کی کمی، روز بروز بڑھتی ہوئی قیمتیں اور گاؤں کے باشندوں کا گاؤں چھوڑ کر چلے جانا۔ ماحول کی بے یقینی اور بے اعتباری نے جلتی پر تیل چھڑکنے کا کام کیا۔ سُچیتا راٹھور نے اس مسئلے پر دن رات غور کیا اور پرانے کالج و یونیورسٹی کے کچھ دوستوں اور اساتذہ سے صلاح لی۔ انھوں نے ہر ممکن مدد کرنے کا یقین دلایا۔ ان کے ہی مشورے پر سُچیتا راٹھور نے کچھ جانے مانے صنعت کاروں کو چٹھیاں لکھیں، اپنا اور اپنے آشرم کا تعارف دیا، پھر ان کو گھمبیر حالات سے آگاہ کیا اور حالات سے نپٹنے کے لیے مالی امداد کی گزارش کی۔ علاوہ ازیں اس نے خود بھی ان سے ملنے کے لیے وقت مانگا تا کہ وہ اس پیچیدہ مسئلے سے ان کو روشناس کرائے۔ کئی خلق دوست صنعت کاروں اور ہمدرد عوام نے سُچیتا کا خیر مقدم کیا اور اس کی باتیں غور سے سنیں۔ اس نے نہ صرف اپنی کارکردگی کے بارے میں آگاہ کیا بلکہ اپنا پلان ان کے سامنے رکھ دیا۔ اب تک سُچیتا کی ناموری اتنی بڑھ چکی تھی کہ لوگ اس کے کام کی تعریف ہر جگہ کرتے تھے یہاں تک کہ کئی اخبارات و دیگر ذرائع ابلاغ میں بھی اس کا ذکر ہوتا تھا۔ خوشی کی بات یہ رہی کہ اس کی معتبریت کو دیکھ کر کچھ فیاض اور ایثار پسند صنعت کاروں نے مثبت ردِ عمل کا اظہار کیا اور عطیے کے طور پر

آشرم کو بھاری یک مشت رقومات سے نوازا جس کے سبب سُچیتا کی حوصلہ افزائی ہوئی اور اس کا بنی نوع انسان کی ہمدردی پر بھروسہ مستحکم ہو گیا۔ اس بارے میں مقامی پریس میں بھی چرچا ہوا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ جہاں چار پانچ کمپنیوں نے آشرم کے بنک کھاتے میں یک مشت رقم ٹرانسفر کر لیا، وہیں ایک پرائیویٹ ٹرسٹ ایسا بھی تھا جو زیادہ رقم تو نہ بھیج سکا مگر ہر مہینے دس ہزار کی رقم ٹرانسفر کرتا رہا۔ بنک والوں نے ٹرسٹ کا نام 'سویتا دیوی چیریٹیبل ٹرسٹ' بتایا اور اس کے علاوہ وہ مزید کوئی انفارمیشن نہیں دے سکے۔ سُچیتا نے ٹرسٹ کے مالک کو نہ کوئی خط بھیجا تھا اور نہ ہی خود جا کر ملی تھی البتہ یہ ممکن ہے کہ مالک نے خبر پڑھ کر بنک یا کسی دوسرے صنعت کار کے ذریعے اس بارے میں جانکاری حاصل کی ہو۔ سُچیتا کو اپنے والد کی نصیحت یاد آ گئی۔ ''بیٹی، جب دائیں ہاتھ سے دان دیا کرو تو بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہیں ہونی چاہیے۔'' سوچنے لگی کچھ سخاوت پسند لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو خیرات دیتے وقت اپنا نام مشتہر نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ ضرور کوئی سخی آدمی ہوگا جس نے اپنی زندگی خدمت خلق کے لیے وقف کی ہے۔ خیر اسے آم کھانے سے مطلب تھا پیڑ گننے سے نہیں۔ وہ من ہی من میں بہت دیر تک مسکراتی رہی۔

(۱۱)

سُچیتا راٹھور نے بچپن میں کہیں پڑھا تھا کہ ''ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا، وہ کون سا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا۔'' اس یتیم خانے کی کہانی انسانی ہمت اور استقلال کی کہانی ہے۔ سُچیتا راٹھور کو جب اس کے منگیتر کوشل ورما نے اپنانے سے انکار کیا تھا تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ ردِ عمل میں اس کے اندر عجیب قسم کی توانائی پیدا ہو گئی اور اس نے قصد کر لیا کہ وہ اپنی زندگی یتیموں خاص کر بے سہارا لڑکیوں کی بہبودی کے لیے وقف کرے گی۔ زندگی کے بارے میں اس کا تصوّر کُلی طور پر تبدیل ہو گیا۔ جنس اس کے لیے سِفلی فعل کے سوا اور کچھ نہ رہا اور شادی اس فعل کا علامیہ بن کر رہ گیا۔ اس نے عمر بھر شادی نہ کرنے اور جنسی تلذّذ سے

احتراز کرنے کی قسم کھالی۔

اس نے جن فلاحی کاموں کا بار اٹھانے کا ارادہ کر لیا ان کے لیے صرف ہمت اور خلوص کافی نہیں ہوتا۔ ایسے کاموں کو انجام دینے کے لیے سرمایے کے مسلسل بہاؤ کی ضرورت پڑتی ہے۔ تاہم ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ جہاں سرمایہ ہوتا ہے وہاں انسانی ہمدردی مفقود ہوتی ہے اور جہاں انسانی ہمدردی ہوتی ہے وہاں سرمایے کی کمی ہوتی ہے۔ سُچیتا کا سب سے بڑا یوگدان یہ تھا کہ اس نے اپنے مستقبل کی فکر نہ کر کے نجی جائیداد کا دھیلا دھیلا اس پروجیکٹ کو کامیاب بنانے کے لیے صرف کیا۔ وراثت میں ملی دولت، زرعی زمین اور آبائی مکان کو فروخت کرنے سے ملا سرمایہ اور مقامی کالجوں میں وقتاً فوقتاً لیکچر دینے کا محنتانہ سب کچھ اسی پروجیکٹ کے لیے خرچ ہوتا رہا۔

اتنا ہی نہیں سُچیتا راٹھور نے متاثرہ گاؤں میں خواتین کی باز آبادکاری کے لیے کئی اقدامات اٹھائے۔ اس نے کملادیوی چٹوپادھیائے اور پُپل جائیکر کی زندگی اور کارناموں کے بارے میں گہرا مطالعہ کیا تھا جنھوں نے تقسیم وطن کے بعد رفیوجی خواتین کو منظم کر کے ان کو خود انحصاری اور خود اعتمادی کا سبق سکھایا تھا تاکہ وہ دوبارہ شان وشوکت اور وقار سے جی سکیں۔ سُچیتا نے انہی کے نقش قدم پر چل کر قحط کی شکار ہوئی عورتوں کو اکٹھا کر لیا اور ان کے لیے پاپڑ، اچار اور مصالحے بنانے، کرگھوں پر کھادی بننے اور راجستھانی پرنٹنگ کی تربیت کا انتظام کرایا۔ علاوہ ازیں اس خطے کی مقبول ترین دستکاریوں کو فروغ دینے کا بھی انتظام کرایا۔ یہ سب کچھ کرنے میں ایک انجان آدمی، رنبیر چوہان، نے اس کا ہاتھ بٹایا جو ایک روز اس کے آشرم میں اچانک وارد ہوا اور جس نے اپنے آپ کو دستکاریوں سے جڑی کسی کمپنی کا منیجر بتلایا۔ اسی کی وساطت سے سُچیتا نے کچھ غیر سرکاری تنظیموں (NGO's) سے رابطہ قائم کر لیا جنھوں نے متعلقہ ماہرین کو تربیت دینے پر معمور کیا نیز تربیت کے دوران ان کاموں میں استعمال ہونے والے آلات و مشینیں بھی مہیا کر لیں۔ آہستہ آہستہ چنندہ عورتوں نے پوری طرح سے تربیت حاصل کر لی۔ اس کے بعد سُچیتا راٹھور نے رنبیر چوہان کی نگرانی

میں ان اشیا کو بنانے کے لیے کچے مال اور بنیادی ساز و سامان ولوازمات فراہم کرائے۔

مذکورہ اشیا کے بنانے، کچا مال خریدنے اور تیار مال کی نکاسی کا انتظام کرنے کے لیے ایک امداد باہمی تنظیم 'بھوانی پور کواپریٹیو' کی بنیاد ڈالی گئی جس کے ارکان ان مزدوروں کے کام کاج میں مدد کرتے اور ان پر نگرانی رکھتے۔ تجربہ کامیاب رہا۔ بہت ساری بیوہ اور افلاس زدہ خواتین اس تنظیم کے ساتھ جڑ گئیں۔ سُچیتا کی مسلسل کوششوں کے سبب بنک سے قرضہ بھی مل گیا جس سے ہاتھ سے چلنے والی درجنوں کھڈیاں (Handlooms) نصب کر لی گئیں اور باضابطہ کھدر کا کپڑا اور دوسری اشیا تیار ہونے لگیں۔ ان کاموں کو انجام تک پہنچانے کے لیے کچھ پڑھے لکھے لڑکوں اور لڑکیوں کو، جنھیں پیدا کاری (Production)، بازار کاری (Marketing) اور کھاتہ داری (Accounts) کی جانکاری تھی، بھرتی کیا گیا۔ سُچیتا راٹھور نے بغیر کسی تاخیر کے مختلف جہات میں قدم اٹھائے۔ ابتدا میں جو عورتیں ان اشیا کو بنانے میں مصروف تھیں، وہی ہفتے میں دو دن یعنی سنیچر اور اتوار کو گاؤں سے باہر جا کر نزدیکی قصبوں اور شہر میں گھر گھر جا کر اس سامان کو بیچنے کی کوشش کرتیں۔ چونکہ ان کا مال سو فیصد صاف اور شدھ تھا اور قیمت بھی واجبی تھی اس لیے دھیرے دھیرے ان کے مال کی مقبولیت اور 'بھوانی برانڈ' کی شہرت دور دور تک پھیل گئی یہاں تک کہ ان علاقوں میں اشرافیہ اور متوسط درجہ کی خواتین ان کے آنے کا انتظار کرنے لگیں۔ دھیرے دھیرے باضابطہ سیلز ویمن کی ایک ٹیم بنائی گئی جو ہر دن مختلف علاقوں میں سامان بیچنے کے لیے چلی جاتیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان علاقوں میں دکانداروں نے بھی بھوانی کواپریٹیو کا مال اپنی دکانوں پر فروخت کرنے کے لیے نمایاں طور پر سجایا۔ سُچیتا راٹھور نے بھوانی پور میں اس تنظیم کو اور بھی مستحکم کرنے کی کوشش کی اور اس کو مکمل کواپریٹیو بزنس ماڈل بنا ڈالا۔ دھیرے دھیرے کھادی اور ولیج انڈسٹریز کمیشن کی اسٹیٹ اکائی سے بھی رابطہ کیا گیا تا کہ تیار مال کی مارکیٹنگ کا بیڑہ وہ بالراست اٹھا لیں۔ ان اقدامات کا فوری اثر یہ ہوا کہ گاؤں سے انخلا کا سلسلہ بند ہو گیا حتیٰ کہ جو لوگ باہر گئے تھے وہ بھی واپس آنے کی سوچنے لگے۔ گاؤں والے آمدنی کے دیگر ذرائع سے مستفید

ہونے لگے اور خواتین اس میں پیش پیش رہیں۔نوجوان جس کام میں مدد کر سکتے تھے، کرتے رہے جبکہ باقی لوگ آنے والی برسات کا انتظار کرنے لگے۔ دستکاریوں میں سرمایہ کاری کرنے سے گاؤں کا حلیہ ہی بدل گیا۔کاشتکاروں کا کھیتی باڑی پر دارومدار کم سے کم تر ہونے لگا اور وہ ناموافق حالات سے مقابلہ کرنے کے اہل بن گئے۔

کئی برس بعد جب رنبیر چوہان کو یقین ہو گیا کہ گاڑی پٹڑی پر آ گئی ہے اور اب اس کا یہاں پر کوئی کام نہیں ہے تو اس نے سُچیتا راٹھور سے اجازت لے کر آشرم سے قطع تعلق کر لیا حالانکہ وہ پھر بھی خیر و عافیت پوچھنے کے لیے کبھی کبھار آ جاتا۔ حیرانی اس بات کی رہی کہ سُچیتا راٹھور نے اسے یہ بھی نہ پوچھا کہ آشرم میں آنے اور ہماری مدد کرنے کی تحریک اسے کہاں سے ملی ؟ سُچیتا کو اندیشہ تھا کہ کہیں رنبیر برا نہ مان جائے۔ دیکھا جائے تو رنبیر چوہان اس ادارے کا مال اپنی کمپنی کے ذریعے بھی فروخت کرا سکتا تھا لیکن اس نے مصلحتاً ایسا نہیں کیا تا کہ یہ تنظیم اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکے اور کسی دوسرے پر منحصر نہ ہو۔

خود انحصاری کے ساتھ ساتھ سُچیتا راٹھور نے تعلیم بالغان (Adult Education) کی جانب بھی قدم اٹھایا اور اس حوالے سے ایک مرکز قائم کیا جہاں وہ اور اس کی کچھ رفیق کار، جو اپنی مدد آپ تنظیم (Self-help Organisation) سے تعلق رکھتی تھیں عورتوں کو پڑھانے لگیں۔ علاوہ ازیں آس پاس کے گاؤں میں بالغ عورتوں کو اکٹھا کر کے انھیں بنیادی تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے عارضی کیمپ بھی لگائے گئے تا کہ وہ نہ صرف تین آر (3R's) سے واقف ہو جائیں بلکہ موڈرن زندگی کی پیچیدگیوں سے بھی باخبر ہو جائیں۔

(۱۲)

تعلیم بالغان و تعلیم نسواں کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ گاؤں کے کسانوں خاص کر خواتین میں جاگرتی پیدا کی جائے۔انھیں ماحول کے تحفظ سے روشناس کیا جائے، پانی کی اہمیت سے

خاص طور پر آگاہ کیا جائے اور اس کی نگہداشت کے لیے اقدامات کرنے کی صلاح دی جائے۔ فالتو بنجر زمین پر جگہ جگہ جوہڑ اور تالاب کھودنے کا مشورہ دیا گیا۔ اس کام کے لیے گاؤں کے نوجوانوں نے رضا کارانہ طور پر بڑے انہماک سے حصہ لیا۔ اس طرح ہر گاؤں میں کئی جگہ تالاب کھودے گئے جن میں برسات کے موسم میں بارش کے پانی کی ذخیرہ اندوزی ہونے لگی۔ بارش ختم ہونے کے بعد بھی وہ تالاب کئی مہینوں تک پانی سے بھرے رہتے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس طریقۂ کار سے زمین میں پانی کی سطح (Water table) کو برقرار رکھنے اور پانی کو ریچارج (Water recharge) کرنے کی کامیاب کوششیں بھی کی گئیں۔ ان اقدامات سے مٹی کی اوپری تہہ تر رہنے لگی اور اس میں محکمہ جنگلات سے مشورہ کر کے دائمی نیم ریگستانی پیڑ پودے اُگائے گئے۔ خوش آئند بات یہ رہی کہ اتنے برسوں کے سوکھے کے بعد موسم نے رواں سال میں پلٹی ماری اور سارے علاقے میں خوب بارشیں ہوئیں۔ ڈسٹرکٹ کلکٹر کے کانوں میں جونہی پانی کے انصرام کی بات پڑی تو وہ خود سُچیتا راٹھور سے یتیم خانے کے دفتر میں ملنے آیا اور وہاں اس کی کارکردگی سے بے حد متاثر ہوا۔ حالانکہ سُچیتا راٹھور کا کام کئی ابعاد میں پھیل چکا تھا پھر بھی اس نے آشرم کو ہی اپنا مرکز بنائے رکھا اور اس کی دیکھ بھال میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

ایک اکیلی عورت نے اس نیم بارانی علاقے کا نقشہ ہی بدل ڈالا۔ کلکٹر نے مختلف کاموں کا جائزہ لے کر سُچیتا راٹھور کی دل کھول کر تعریف کی اور سرکاری چینل کے ذریعے اپنے سے اوپر افسران کو بھی آگاہ کر لیا۔ کلکٹر کا بس آنا تھا کہ نیوز رپورٹروں اور دوردرشن کے نمائندوں کی ہوڑ لگ گئی۔ آئے دن سُچیتا کی حصولیابیوں کی خبریں مقامی وقومی اخباروں میں شائع ہونے لگیں اور دوردرشن پر بھی تبصرے نشر ہونے لگے۔ اسے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا مگر اب تو یہ معاملہ اس کے دائرۂ اختیار سے باہر تھا اور اس بارے میں وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ البتہ اس کا ایک مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ صنعت کاروں اور تاجروں نے دل کھول کر سُچیتا کے این.جی.او کو مالی امداد دی۔

برسات شروع ہونے سے پہلے گاؤں کی ہر عورت کو اپنے گھر کے نزدیک دو گڑھے کھودنے کا مشورہ دیا گیا۔ دریں اثنا محکمہ جنگلات سے رابطہ کر کے نیم خشک علاقے کے موافق نوخیز پودوں کا انتظام کیا گیا جوان عورتوں میں بانٹے گئے۔ ہر عورت کو کھودے ہوئے گڑھوں کے واسطے پنیری کے دو دو پودے بانٹ دیے گئے تاکہ وہ ان کی شجرکاری کریں اور اس کے بعد ان کی دیکھ بھال کرنا بھی انہی کے ذمے رکھا گیا۔ یہ تجربہ بھی کافی حد تک کامیاب رہا۔ جہاں کہیں لگائے گئے پودے کسی وجہ سے مرجھا جاتے وہاں فوراً نئے پودے لگا کر دوبارہ کوشش کی جاتی تاکہ محنت ضائع نہ ہو۔ محنت کش انسان جب اپنی محنت سے لگائے ہوئے پیڑ پر پھل لگتے دیکھتا ہے تو اس کا حوصلہ دگنا چوگنا ہو جاتا ہے۔ یہی حال بھوانی پور کی عورتوں اور نوجوانوں کا تھا۔ ان کا حوصلہ بھی آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگا تھا۔

شجرکاری سے ان تمام گاؤں کی فضا ہی بدل گئی۔ بارش کے پانی کی ذخیرہ اندوزی اور شجرکاری کے سبب زمین کی زرخیزی میں کافی تبدیلی آ گئی اور چند ہی برسوں میں یہاں روایتی فصلوں جیسے باجرا، مکئی، گنوار پھلی، چنے، سرسوں اور مصالحہ جات کے علاوہ ریتیلی اور تیزابی مٹی کے مطابق مناسب اناج اور میوہ بردار پیڑ پودے بوئے جانے لگے جن سے یہاں کے کسانوں کی آمدنی میں کافی اضافہ ہو گیا۔ دیکھا جائے تو یہ سب کچھ سُچیتا کی کئی برسوں کی محنت، لگن اور تپسیا کا نتیجہ تھا۔ کبھی کبھی وہ صبح سویرے ان ہرے بھرے کھیتوں کے بیچ سیر کرنے دور تک نکل جاتی جہاں نسیم صبح اناج کے پُر شباب خوشوں سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی اس کے گالوں کو چھو جاتی۔ تازہ ہوا کے جھونکے اس کے اعضا میں ایک نئی روح پھونک دیتے۔ اس وقت سُچیتا کا دل باغ باغ ہو جاتا اور اس کو ہرنی کی مانند ان کھیتوں میں کدکڑے مارنے کو جی چاہتا۔

بھوانی پور تحریک کوئی بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ اس کے لیے سُچیتا نے اپنے برسوں کے تجربے، وسیع مطالعے اور صلاح کاروں کے مشوروں سے فیض اٹھایا تھا، نامور شخصیات کی حیات سے تحریک پائی تھی اور سب سے اہم بات یہ کہ اس کے عزم، صبر اور ثابت قدمی نے اس کے لیے نئے افق تلاشنے میں مدد کی تھی۔ وہ اس امتحان میں کامیابی سے سرفراز ہوئی تھی۔ اس

کارروائی میں وہ اکیلی نہیں تھی بلکہ اس کے ساتھ وہ ساری جماعت تھی جس کا انتخاب اس نے گاؤں کی مستعد آمادہ خواتین میں سے کیا تھا تاکہ ہدف حاصل کرنے میں کامیابی ملے۔ انھوں نے نہ کبھی اپنی تھکن کا اظہار کرنے کے لیے آہ بھری اور نہ ہی چھوٹی موٹی ناکامیوں سے ناامید ہوکر سوال اٹھائے۔ یہ ان کے رہنما کی کرشمائی شخصیت کا نتیجہ تھا۔ انھیں اپنے رہنما پر پورا بھروسہ تھا۔ ان کا رہنما کوئی اور نہیں بلکہ فرشتہ نما سُچیتا راٹھور تھی۔ دراصل یہ حصولیابیاں سُچیتا کی لیڈرشپ کی خوبیوں کی تصدیق کرتی ہیں۔ اس نے ثابت کردیا کہ انسان کے حوصلے اور پرواز کی کوئی سیما نہیں ہوتی، وہ چاہے تو ستاروں پر کمند ڈال سکتا ہے۔ اس کی طرز قیادت مثالی اور کرشمائی تھی۔ وہ خود اپنے گروپ کے لیے ایک مثال بن کر آگے قدم بڑھاتی۔ اس سے پہلے کہ وہ کسی عورت کو کوئی جوکھم اٹھانے کے لیے کہہ دیتی وہ خود اس کام کو کرنے کی کوشش کرتی تاکہ وہ یہ جان سکے کہ کیا وہ کام اسے ہوسکتا ہے یا نہیں۔ اپنی ٹیم کے ساتھ وہ کندھے سے کندھا ملا کر کام کرتی تھی۔ چاہے گرمی ہو یا سردی، وہ خود بھی دوسروں کے سنگ گینتی اور پھاوڑے سے شجرکاری کے لیے گڑھے کھودتی۔ دستکاریاں بنانے والے کاریگروں سے وہ ذاتی طور پر ان کے تجربوں، مشکلوں اور پریشانیوں سے روشناس ہونے کی کوشش کرتی اور پھر ان کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کرتی۔

بہرحال اس کی مدد کے لیے ایشور نے نہ جانے کہاں سے رنبیر چوہان کی شکل میں ایک فرشتہ بھیج دیا تھا جو قدم قدم پر اس کی مدد کرتا۔ اس نے بہت سارے کام یوں حل کیے جیسے تجربہ کار ہو۔ ورنہ تو کبھی کبھار وہ کام سُچیتا کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اس کے لیے وہ ہمیشہ خود کو بھگوان کی قرضدار سمجھتی تھی۔

(۱۳)

بنیادی طور پر سُچیتا راٹھور کا مرکزِ توجہ وَردان اَناتھ آشرم تھا۔ اس نے اس یتیم خانے کو اپنی

زندگی کا نصب العین بنایا تھا جہاں غریب نادار و لاوارث بچوں خصوصاً لڑکیوں کو پناہ ملتی تھی۔ یتیم خانے کے صدر دروازے پر لٹک رہے بچوں کے کھٹولے میں کبھی کبھار کوئی کنواری عورت شادی سے پہلے جنا ہوا بچہ چھوڑ کر جاتی۔ یہ بچے ان کے شباب کی لغزشوں، مجبوریوں اور مردوں کے استحصال کی یادگار تھے۔ بچے کو کھٹولے سے اٹھا کر موسی یتیم خانے میں لے آتی اور سُچیتا دیدی کو خبر کرتی۔ یتیم خانے کی رجسٹر میں اس کا اندراج تفصیل سے کیا جاتا اور پھر پولیس تھانے میں اس کی رپورٹ لکھوائی جاتی۔ ساتھ ہی بچے کو نہلا دھلا کر صاف کپڑے پہنائے جاتے اور اندر کمروں میں رکھے ہوئے خالی پنگھوڑے میں سلایا جاتا۔ بچہ گود میں اٹھاتے وقت موسی کا دل بھر آتا۔ اسے ان دیکھی ماں پر غصہ بھی آتا اور رحم بھی۔ غصہ کرنے کی وجہ صرف یہ ہوتی کہ کنواری ماں کو کسی بھی صورت میں لکشمن ریکھا پار نہیں کرنی چاہیے تھی۔ رحم اس لیے کہ نہ جانے دنیا میں کتنی بے بس کنواری دوشیزائیں روزانہ نرینہ ہوس کا شکار ہوتی ہوں گی اور بچے پیدا کرنے پر مجبور ہوتی ہوں گی۔ وہ ممتا کا گلا گھونٹ کر ان جگر کے ٹکڑوں کو کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں پر پھینکتی ہوں گی یا پھر یتیم خانوں کی چوکھٹ پر ڈالنے کے لیے مجبور ہوتی ہوں گی۔ بعض اوقات قدرے بڑے بے سہارا بچے بھی اس یتیم خانے میں داخل کیے جاتے کیونکہ ان کے والدین قدرتی حادثات کا شکار ہو جاتے یا پھر ان کی آپس میں نہیں بنتی اور بچوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر دونوں الگ الگ راستے اپنا کر دنیا کی بھیڑ میں کھو جاتے۔ ایسے بچوں کی دیکھ ریکھ کرنے کے لیے کوئی رشتے دار سامنے نہیں آتا۔

آشرم میں بچوں کی تعداد بتدریج بڑھنے لگی۔ اس لیے عمارت کی توسیع کرنا ضروری تھا اور پھر اسٹاف کی بھرتی بھی کرنی پڑی۔ اسٹاف کے بارے میں سُچیتا دیدی بڑی محتاط رہتی تھی، ساری کارروائی خود ہی انجام دیتی اور امیدوار کے بیک گراونڈ کا پورا پتہ لگاتی۔ وہ مخلص اور ایمان دار امیدواروں کو ہی ترجیح دیتی تھی۔ بچوں کی پرورش کے لیے پاس پڑوس سے خواتین کا انتخاب کیا جاتا جو یا تو بیوہ ہوتیں یا پھر جن کا کوئی سہارا نہ ہوتا۔ ایسی خواتین کے ساتھ تو سُچیتا دیدی کو وقتاً فوقتاً واسطہ پڑتا تھا۔

سُچیتا راٹھور کو اس بات کا احساس تھا کہ صرف یتیم خانہ کھولنے سے کمسن بچوں کی زندگی کا تحفظ اور ان کی نشو و نما نہیں ہو سکتی۔ ان کے لیے اچھی تعلیم اور کھیل کود کا انتظام بھی کرنا پڑے گا۔ کچھ صلاح کاروں سے مشورہ کر کے اس نے یتیم خانہ کے بغل میں ہی ایک چھوٹا سا اسکول بنوا لیا اور وہاں پر پاس پڑوس کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو بطور ٹیچر مقرر کیا۔ پہلے پہل تو بہت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، کبھی تربیت یافتہ انسانی وسائل کی عدم دستیابی کے باعث اور کبھی سرمائے کی کمی کی وجہ سے۔ لیکن سُچیتا راٹھور تو ہار ماننے والوں میں سے تھی ہی نہیں، اس نے ہمت کر کے یہ رکاوٹیں بھی پار کر لیں۔ ابتدا میں پانچویں جماعت تک بچوں کی تعلیم کا بندوبست آشرم کے اسی وَردان پرائمری اسکول میں کیا گیا اور اس کے بعد جو بچّے دلچسپی دکھاتے ان کو نزدیک ہی قصبے میں واقع ہائر سیکنڈری اسکول میں بھیجا جاتا۔ جن بچوں کو کھیل کود میں زیادہ لگاؤ ہوتا ان کو ایسی سرکاری تربیت گاہوں میں داخلہ دلوایا جاتا جہاں ان کی دلچسپی کا سامان ہوتا۔ ایسی تربیت گاہوں کے انتظامیہ سُچیتا راٹھور کی ان بے لوث کوششوں کو سراہتے اور فراخ دلی سے وہ سب سہولتیں مہیا کرتے جو ان کے اختیار میں ہوتیں۔ جن بچوں کو تربیت پانے کے لیے آشرم سے دور ہوسٹل میں رہنا پڑتا تھا ان کا خرچہ برداشت کرنے کے لیے سُچیتا راٹھور نے کچھ صنعت کاروں سے بات کی جنھوں نے ان بچوں کو سپانسر کرنے کی ہامی بھر لی۔ کچھ برس بیت جانے کے بعد جب سُچیتا کو محسوس ہوا کہ اس کی مالی حالت سُدھر چکی ہے تو اس نے پرائمری اسکول کو وَردان ہائر سیکنڈری اسکول میں تبدیل کر دیا۔ پھر تو آس پاس کے گاؤں حتیٰ کہ قصبے کے طالب علم بھی وَردان اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے خواہشمند ہو گئے۔ یہاں فیس قدرے کم تھی مگر تعلیم کا معیار بلند تھا۔ سُچیتا کے علاوہ باقی ماندہ اساتذہ بھی بڑی لگن سے طلبہ کو پڑھاتے تھے۔ انجام کار اس اسکول کی کارکردگی بورڈ امتحانات میں قابل ستائش نظر آنے لگی۔

بھوانی کواپریٹو، وَردان اَناتھ آشرم اور وَردان سیکنڈری اسکول بھوانی پور تحریک کے سنگ میل بن گئے جن کی وجہ سے بھوانی پور کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ گرد و نواح میں اس جگہ کے

بارے میں لوگ جاننے لگے۔ اس ایریا کے چنے ہوئے نمائندے یعنی ایم ایل اے اور ایم پی بعض اوقات یہاں کے اَناتھ آشرم، اسکول اور گاؤں گاؤں پھیلی بھوانی کواپریٹو سنستھا کی شاخوں کا دورہ کرتے اور وہاں کے منتظمین سے جانکاری حاصل کرتے۔ وہ اپنے ایم پی لیڈ فنڈ سے ان اداروں کو نہ صرف عطیہ دیتے بلکہ ان کے لیے بنیادی سہولتیں بھی مہیا کر لیتے۔ کہتے ہیں کہ ہمت مرداں، مدد خدا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں کہاں سے لوگ ان خواتین کی امداد اور حوصلہ افزائی کرنے کے لیے چلے آتے۔ اُدھر شجر کاری کی مہم نے اپنا جلوہ دکھا دیا اور محکمہ جنگلات نے اس بارے میں بھرپور تعاون کیا اور اِدھر عوامی نمائندوں نے ان گاؤں کو شہر سے جوڑنے کے لیے سڑکیں بنوائیں، ٹیوب ویل کھدوائے اور بجلی و پانی کا انتظام کروایا۔ قدرتی آبی وسائل کے بندوبست اور برسات کے پانی کے بروقت تحفظ سے زمین کے واٹر ٹیبل میں کافی فرق آنے لگا۔ اب تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہی وہ گاؤں تھے جنھیں تین سال لگاتار سوکھے کی مار جھیلنی پڑی تھی اور ہزاروں لوگوں کو بے گھر ہو کر نئی پناہ گاہیں تلاشنی پڑی تھیں۔

اس خوشحالی کی ذمہ دار بھوانی کواپریٹو کی وہ صنعتیں تھیں جو یہاں مصالحے، پاپڑ، اچار، کھادی اور دستکاریاں تیار کرتی تھیں اور ان کی مارکیٹنگ کرنے میں بھی کامیاب ہو چکی تھیں۔ انھوں نے اپنے اعلیٰ معیار سے کبھی سمجھوتا نہیں کیا، اس لیے 'بھوانی برانڈ' دور دور تک ایک جانا مانا برانڈ بن گیا۔ ان مصنوعات کی مقبولیت دیش کے کونے کونے تک پھیل گئی۔ ان کے علاوہ وہ یتیم خانہ بھی تھا جہاں یتیم بچے پرورش پا رہے تھے، تعلیم حاصل کر رہے تھے اور زندگی کے مختلف شعبوں میں ترقی کر رہے تھے۔ وَردان آشرم کے کئی بچوں نے بورڈ کے امتحانات میں امتیازی پوزیشن حاصل کر کے اسکالرشپ حاصل کیا اور اپنی تعلیم آگے جاری رکھی۔ کئی بچوں نے تو بارہویں کی تعلیم پاس کر کے کالجوں میں داخلہ لیا یہاں تک کہ کچھ بچے پیشہ ورانہ کالجوں میں بھی داخلہ لینے میں کامیاب ہو گئے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد کچھ نوجوانوں نے جہاں اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا وہیں کچھ ایسے نوجوان بھی نکلے جو سماج سدھار کے کاموں میں

جُٹ گئے۔ ان میں سے چند ایک رضا کارانہ طور پر اس آشرم اور اسکول سے جڑ گئے۔ بہر حال جو خود کفیل ہوئے انھوں نے آشرم کو خیر باد کہا اور شادی کر کے اپنی زندگی گزارنے میں کامیاب ہوئے۔ البتہ قابل غور بات یہ ہے کہ اس آشرم سے جتنے بھی نوجوان تحصیل علم کے بعد کسی نوکری یا کاروبار میں لگ گئے انھوں نے اس ادارے کو فراموش نہیں کیا، وہ اس آشرم کو مالی طور پر مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے رہے۔ اس طرح سُچیتا راٹھور کو یتیم خانہ اور اسکول چلانے میں بہت زیادہ مشکل در پیش نہیں آئی۔ یہ تو سُچیتا دیدی کی کرشمائی شخصیت کی سب سے بڑی کامیابی تھی کہ اس یتیم خانے سے نکلے ہوئے لڑکے اور لڑکیاں کبھی بھی اس سنستھا کو نہیں بھولے اور دامے، درمے، قدمے وسخنے اس آشرم کی مدد کرتے رہے۔ جب بھی کبھی فرصت مل جاتی تو خود اس پرستش گاہ کی زیارت کرنے چلے آتے۔

ان اقدامات کا ایک اور نتیجہ سامنے آیا اور وہ یہ کہ کچھ برسوں کے بعد سرکار نے بھوانی پور میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے الگ الگ ہائر سیکنڈری اسکول کھول دیے اور اب ایک کالج کھولنے کی بھی تیاریاں ہو رہی تھی۔ غرض یہ کہ تعلیم کے لحاظ سے ہر طرف ترقی کے راستے کھلتے گئے۔ اسکول اور کالج کے ساتھ ساتھ لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے الگ الگ ہوسٹلوں کا انتظام بھی کیا گیا جہاں دور دراز گاؤں سے آنے والے زیر تعلیم طلبہ اور طالبات رہنے لگے۔

علاوہ ازیں جو عورتیں کواپریٹیو تنظیم کے ساتھ جڑی ہیں وہ بھی گاہے بہ گاہے اپنی کمائی کا کچھ حصہ اس سنستھا کو بطور عطیہ دیتی ہیں۔ انھیں محسوس ہوتا ہے کہ دیدی ان کے لیے بھگوان کی بھیجی ہوئی ساکھشات دیوی ہے جس نے ان کو نئی زندگی بخشی ہے اور انھیں جینے کا سلیقہ سکھلایا ہے۔ ایسی سرخروئی تو سچیتا راٹھور کے وہم وگماں میں بھی نہ تھی۔ اس کے خواب تو بہت محدود تھے تاہم وہ وقت کے ساتھ ساتھ نئے نئے افق تلاشنے میں سرگرداں رہی۔ اس کی استعداد کو دیکھ کر امیر حمزہ ثاقب کا ایک شعر یاد آتا ہے:

تمھاری ذات حوالہ ہے سرخ روئی کا
تمھارے ذکر کو سب شرط فن بناتے ہیں

تنہائی میں جب کبھی سُچیتا راٹھور فکر و تردّد میں غرق ہو جاتی تو ماضی کی یادیں اس کے ذہن کے پردے پر ایک کے بعد ایک ابھرتی چلی جاتیں۔ بچپن میں ماں باپ کا لاڈ پیار، اسکول اور کالج کا کھلنڈرا پن، پیار کی وہ مختصر مگر انمول گھڑیاں، اس کی محبت کی خبر پا کر والدین کا تلملانا اور پھر اس کی شادی کرنے کا اچانک فیصلہ لینا، شادی کے موقع پر پیش آیا ڈرامہ اور پھر ایک نئی زندگی کی شروعات۔ بارہا وہ بھاسکر بھاردواج کے بارے میں سوچتی۔ اسے یاد ہی نہیں آ رہا تھا کہ دونوں ایک دوسرے سے پہلی بار کب اور کیسے روبرو ہوئے۔ دونوں ایک ہی جماعت میں پڑھتے تھے۔ ایک دوسرے کے قریب کس طرح آ گئے، وہ یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بس دھندلی دھندلی سی یادیں تھیں۔ بھاسکر کی محبت کو وہ دل سے کبھی مٹا نہ سکی۔ وہ چاہتی تھی کہ ایک بار بس ایک بار بھاسکر کا دیدار کر لے، پھر اس کو زندگی سے کوئی گلہ شکوہ نہیں رہے گا۔

دراصل پیار بے ساختہ اور بلا ارادہ ہوتا ہے۔ اس میں غور و فکر کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کا کوئی منصوبہ ہوتا ہے۔ بھاسکر بھاردواج کلاس میں ڈرا ڈرا سا اور خاموش رہتا تھا۔ وہ تنہائی پسند اور دروں بین تھا۔ شاید یہ اس کے ماحول کی دین تھی کیونکہ اسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ دوسرے طلبہ کے مقابلے میں ذات کے اعتبار سے کم تر تھا۔ بہت کوشش کرنے کے بعد بھی اساتذہ اس کے منہ سے جواب اگلوانے میں کامیاب نہیں ہوتے تھے۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ اس کی عقل و فہم اور آگاہی پر کوئی انگلی اٹھا سکتا تھا۔ اس کی یہی ادا سُچیتا کو بھا گئی تھی۔ اس نے بھاسکر سے گفتگو کرنے کی کئی بار شعوری کوشش کی، کبھی کامیاب ہو جاتی اور کبھی ناکام۔ آخرکار اس کی پیہم کوششیں رنگ لائیں اور دونوں فرصت کے سمئے ایک دوسرے کے ساتھ نظر آنے لگے۔ ایک دوسرے کے ٹفن کا کھانا ساجھا کرتے۔ سہیلیوں نے سُچیتا کو کئی بار تنبیہ کرنے کی کوشش کی کہ اس دوستی کا انجام مثبت نہیں ہوگا اور بعد میں وہ بہت پچھتائے گی مگر سُچیتا کے سر پر پیار کا بھوت سوار ہو چکا تھا وہ کسی کے صلاح مشورے پر کیسے

دھیان دیتی۔ یوں بھی وہ قائم شدہ قوانین سے ہمیشہ روگردانی کرتی رہی تھی۔

بھاسکر بھاردواج سُچیتا راٹھور سے لاانتہا عشق کرتا تھا حالانکہ اسے اپنی چاہت کی حدوں کی پوری آگہی تھی۔ وہ پہلے ہی سے جانتا تھا کہ ان دونوں کی یہ محبت پروان نہیں چڑھ سکتی ہے۔ سُچیتا راٹھور اس کی پہنچ سے بہت دور ہے۔ ابتدا میں اس نے سُچیتا کو کوئی اہمیت نہیں دی اور آگے بڑھنے سے کئی بار روکا بھی مگر وہ مصر تھی اور بھاسکر کو دل کی گہرائیوں سے چاہتی تھی۔ بہت کوشش کے بعد آخر کار بھاسکر نے ہتھیار ڈال دیے۔

معاشقہ دو ڈھائی سال چلتا رہا۔ اسے ایک قسم کا افلاطونی پیار کہا جاسکتا ہے۔ سکھ دکھ کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس سے بھی زیادہ زندگی، وجود، مستقبل اور نصب العین کی باتیں ہوتی رہیں۔ ذہن سے ذہن ملتے رہے، آپس میں مکالمہ کرتے رہے مگر جسموں نے کبھی قریب آنے کی کوشش نہیں کی۔ دونوں مثالیت پسند تھے اور ان کی خیالات ایک جیسے تھے۔ وہ انسانیت کے لیے کچھ کر گزرنا چاہتے تھے -غریبوں کے لیے، محتاجوں کے لیے، بیواؤں کے لیے، یتیم بچوں کے لیے اور معذوروں کے لیے۔ انھیں اپنی ذاتی زندگی کی زیادہ پروانہ تھی۔ ہاں کھانے کے لیے دو وقت کی روٹی، پہننے کے لیے سادہ کھدر کا لباس اور رہنے کے لیے ایک معمولی سا جھونپڑا مل جاتا، اس سے بڑھ کر نہ انھیں چاہت تھی اور نہ طلب۔ لیکن ایک ساتھ رہنے کا یہ خواب ادھورا ہی رہ گیا اور دونوں کی راہیں الگ ہوگئیں۔

بھاسکر بھاردواج نے نہ صرف اپنی تعلیم امتیاز کے ساتھ مکمل کرلی بلکہ اپنے بل بوتے پر ایک نئے کاروبار کا آغاز کیا۔ سُچیتا سے الگ ہوجانے کی وجہ سے اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ اسے حیرت ہوئی تھی کہ اکیسویں صدی میں بھی اس کے ملک میں ذات پات کی منافرت اس شدّت سے رائج ہے۔ قرونِ وسطیٰ ہی سے بے شمار اصلاح کاروں نے ذات پات کی ان دیواروں کو مسمار کرنے کی کوششیں کی تھیں مگر ناکام رہے۔ یا تو ان کی کوششوں میں خلوص کی کمی رہ گئی یا پھر ہندو سماج میں اس وبا کی جڑیں اتنی گہری تھیں کہ کوئی بھی آندھولن اس پر اثر نہیں کر پا رہا تھا۔ کبیر، نانک، مادھو آچاریہ، چیتنیہ مہاپربھو، جئے دیو، رامانند، روی داس وغیرہ نے بھگتی

تحریک کے ذریعے سماجی شعور کو اِرتقاع سے ہم کنار کرنے کی بہت کوشش کی مگر جزوی طور پر کامیاب رہے۔انیسویں صدی میں آریہ سماج اور برہمو سماج کے بانیوں نے ہزار کوششیں کیں کہ ہندو سماج کو بدل ڈالیں مگر آخر ہوا کیا؟ وہی ڈھاک کے تین پات۔ ہندو سماج نے ان تحریکوں کی حاشیہ سازی کر کے ان کو حاجز کر دیا۔تحریکیں مرکزی دھارے سے کٹ کر الگ جزیرے بن کر رہ گئیں۔

یہ سچ ہے کہ معاشی مجبوریوں اور سماجی اختلاط کے سبب بڑے بڑے شہروں میں کافی حد تک یہ دوریاں مٹ گئی ہیں، کارخانوں اور دفتروں میں سبھی ذاتوں کے لوگ ایک ساتھ کام کرتے ہیں، ایک ہی نل سے پانی پیتے ہیں اور ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں مگر یہاں بھی جب بات شادی کی ہوتی ہے تو پہلے ذات کے بارے میں پوچھا جاتا ہے اور شادی اپنی ہی برادری میں جائز ٹھہرائی جاتی ہے۔ ہاں چند سر پھرے جوڑے ایسے ملتے ہیں جو بین الذاتی ازدواجی بندھن میں بندھ جاتے ہیں مگر انھیں آگے جا کر کئی مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

رہا سوال دیہی علاقوں کا۔ وہاں کا تو پرمیشور ہی نرالا ہے۔ وہاں کھپ بنے ہوئے ہیں، پنچائتیں بنی ہوئی ہیں جو اس بات کا فیصلہ کرتی ہیں کہ شادی کن ذاتوں کے درمیان جائز ہے اور کن میں نہیں۔ اگر کوئی لڑکا یا لڑکی روگردانی کرتا ہے اور اس دائرے کو پھلانگ کر دوسری کسی ذات میں شادی کرتا ہے تو اس کو سزا کا مرتکب قرار دیا جاتا ہے جس میں جلاوطنی اور سماجی برأت تک کی نوبت آتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے آئین میں ذات پات کی تفریق جرم ہے اور انسان کو اپنی مرضی سے کسی بھی دھرم، ذات یا نسل کی لڑکی سے شادی کرنے کی کھلی چھوٹ ہے مگر یہ قانون کتابوں اور کورٹ کچہری تک محدود ہے۔ گاؤں میں کوئی لڑکا ایسا کام کرے تو اسے گاؤں والے سخت سے سخت سزا دیتے ہیں۔ اگر وہ پولیس میں ایف آئی آر درج کرانا چاہے تو کوئی کرنے کو تیار ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کو بہلا پھسلا کر گاؤں والوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ کوئی جوڑا گاؤں سے بھاگ جائے تو انھیں پولیس ڈھونڈ ڈھانڈ کر گاؤں کی پنچایت کے حوالے کر دیتی ہے۔ سیاسی رہنما خاموش رہتے ہیں کیونکہ انھیں اپنے ووٹ بنک کی فکر ستاتی

ہے اور وہ نہیں چاہتے ہیں کہ کسی معمولی بندے کے لیے وہ اپنے ووٹروں کا دل آزردہ کرلیں۔ ایک امید پھر بھی باقی رہتی ہے وہ ہے کورٹ کی۔ لیکن کورٹ میں جانے کے لیے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے، غریب جوڑے اتنا سرمایہ کہاں سے لاسکتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ قانون بھی طاقت ور لوگوں کا ساتھ دیتا ہے اور ایسے معاملوں میں محض تماشائی بن کر رہ جاتا ہے۔

بین مذہبی شادیوں کے لیے تو اس سے بھی زیادہ خمیازہ اٹھانا پڑتا ہے۔ ان پر اجتماعی ردِ عمل ہوتا ہے۔ لوگ مرنے مارنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ غیرت کی خاطر قتل و غارت کا رواج تو برصغیر میں عام ہے۔ غرض ہر طرف محبت کا جنازہ اٹھایا جاتا ہے۔

سُچیتا راٹھور کو آج بھی اس بات پر پچھتاوا ہورہا ہے کہ وہ اپنے والدین کو اس بات پر قائل نہیں کرسکی کہ موجودہ صدی میں ذات پات کا نظریہ فرسودہ ہوچکا ہے۔ وہ بھاسکر کو بہت چاہتی تھی اور اس سے دور نہیں ہونا چاہتی تھی۔ شاید بھگوان نے اس کی عبادت قبول کرلی اور اس کی شادی ہوتے ہوتے رہ گئی تاکہ وہ کم سے کم بھاسکر کی یادوں کے سہارے زندگی کے باقی ماندہ دن گزار سکے۔ وہ زندگی کی اس کروٹ پر بہت خوش تھی۔ جب سے دونوں بچھڑ گئے تھے سُچیتا کو بھاسکر کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہوسکا۔ کہاں ہے؟ کیا کرتا ہے؟ پڑھائی مکمل کرلی یا نہیں...؟ نوکری لگ گئی یا نہیں...؟ شادی کرلی یا نہیں...؟ وہ تو بہت ہی ذہین اور محنتی طالب علم تھا اور ہمیشہ امتیازی نمبرات لے کر پاس ہوتا تھا۔ سُچیتا چاہتی تھی کہ آئی اے ایس کا امتحان پاس کرے اور کہیں ڈی ایم کی پوسٹ پر تقرری ہوجائے۔ درجہ فہرست لوگوں کے لیے تو ریزرویشن بھی میسر ہے۔ کیا ہوا کہ اس کے ساتھ ازدواجی بندھن نہیں بندھا مگر اس کو ڈی ایم کی کرسی پر دیکھ کر سُچیتا کا سینہ چوڑا ہوجاتا۔ وہ اپنی سہیلیوں سے کہتی کہ یہی ہے میرا وہ ایکس... .بوائے فرینڈ.... جس کا تم ہمیشہ مذاق اڑایا کرتی تھیں مگر مجھے اس پر ہمیشہ ناز تھا۔

جمہوریت کی اپنی خوبیاں ہوتی ہیں اور اپنی کمزوریاں بھی ہوتی ہیں۔ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اکثریت کو رائے دینے کا حق حاصل ہوتا ہے چاہے وہ صرف ووٹ دینے تک ہی محدود کیوں نہ ہو۔ چنانچہ ان کے چُنے ہوئے نمائندے ملک کے قانون بناتے ہیں اس لیے مانا جاتا ہے کہ یہ قانون اکثریت نے ہی بنائے ہیں اور عام رعایا کے فائدے کے لیے ہیں۔ جب یونان میں جمہوری سوچ کی ابتدا ہوئی تھی ایتھنز کے سبھی لوگ قانون بناتے وقت قانون سازی میں براہ راست شریک ہوجاتے اور اپنے ووٹ کا جائز استعمال کرتے تھے۔ چھوٹے سے شہر کی چھوٹی سی آبادی میں یہ سب کرنا ممکن تھا مگر اب جبکہ جمہوری ممالک میں کروڑوں لوگ رہتے ہیں ہر بار اس طریقے سے قانون بنانا ممکن نہیں۔دوسری خوبی یہ ہے کہ عام طور پر جمہوریت میں جو قانون بنائے جاتے ہیں ان میں رعایا کی فلاح و بہبود کا خیال رکھا جاتا ہے۔

اس کے برعکس عملی جمہوریت کی سب سے بڑی کمزوری ناخواندگی ہوتی ہے۔جس ملک کے لوگوں میں ناخواندگی کی شرح بہت زیادہ ہوتی ہے وہاں لوگوں کو نہ تو ووٹ کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے اور نہ ہی صحیح و غلط قانون کی پرکھ ہوتی ہے۔ ناخواندہ رعایا جنونی نعروں اور لبھاونے وعدوں کی گرویدہ ہوجاتی ہے اور جذبات انگیز خطیب ان کی اس کمزوری کا بھرپور فائدہ اٹھالیتے ہیں۔علاوہ ازیں جہاں اکثریت خواندہ اور فعال نہیں ہوتی یا یوں کہیے کہ اندھی، گونگی اور بہری ہوتی ہے وہاں دوسرے لوگ اس کا فائدہ اٹھالیتے ہیں اور قانون کی گنگا اپنی جانب بہالیتے ہیں۔

ہمارے ملک کا یہ المیہ ہے کہ جب ناخواندہ اکثریت سو رہی تھی اس وقت چند مٹھی بھر چالاک زعیم جاگ رہے تھے اور خود اقتدار میں آنے کی اسکیمیں بنا رہے تھے تاکہ طاقت ان کے ہاتھ میں آجائے اور پھر کبھی ان سے یا ان کے وارثوں سے چھینی نہ جائے۔ اقتدار میں آنے کے بعد ان لوگوں نے انگریزوں کی حکمت عملی 'بانٹو اور راج کرو' پر پوری طرح عمل کیا۔

معاشرے کی بھلائی کے لیے یکساں قانون بنانے کے بجائے انھوں نے سیکولرازم کی آڑ میں الگ الگ فرقوں کے لیے الگ الگ قانون بنائے اور ان کے درمیان خلیج پیدا کر لی تاکہ لوگ ہمیشہ آپس میں لڑتے رہیں اور ان غاصبوں کی ہر بار تاج پوشی کرتے رہیں۔ ایک اور کمزوری جو سامنے آئی ہے وہ یہ کہ آبادی کو کنٹرول کرنے کی کوشش کوئی نہیں کرتا کیونکہ انھیں ووٹ دینے والوں کے عتاب کا اندیشہ رہتا ہے اور اگلے انتخابات میں ہارنے کا ڈر ستاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمرجنسی کے دوران اس جانب نیم دلی کے ساتھ کئی اقدامات اٹھائے گئے تھے مگر ان قانونوں کے خلاف حزب اختلاف کی سبھی پارٹیاں صف آرا ہو گئی تھیں اور ان میں وہ پارٹی بھی شامل تھی جو آج بڑھتی ہوئی آبادی کو ملک کی بدحالی کا سب سے بڑا سبب گردانتی ہے۔ ان کی اس پرزور مزاحمت و مخالفت کی وجہ سے نہ صرف خاندانی منصوبہ بندی ناکام رہی بلکہ اس وقت کی سرکار بھی گر گئی تھی۔

اقتدار پانے کی ہوس سیاست دانوں کو کسی بھی حد تک لے جاسکتی ہے۔ کبھی وہ یکسر علیحدگی کے نعرے لگاتے ہیں، کبھی علاقائی امنگوں کے لیے سرکاری جائیداد کو آگ لگا دیتے ہیں، کبھی ریزرویشن پر نوجوانوں کو خودسوزی پر آمادہ کرتے ہیں اور کبھی فرقہ وارانہ فسادات کو بھڑکا کر اپنا الو سیدھا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بھاسکر نے ابھی اپنی تعلیم پوری ہی کی تھی کہ سارے ملک میں ایک لہر سی اٹھی اور طالب علم سڑکوں پر اتر آئے۔ ان میں دو مخالف جماعتیں تھیں، ایک وہ جو ریزرویشن کے حق میں تھی اور چاہتی تھی کہ یہ سہولت مستقل طور پر قانونی حیثیت اختیار کر لے اور داخلے کے علاوہ سرکاری نوکریوں میں ترقی کے مختلف مرحلوں پر بھی سختی سے لاگو ہو۔ دوسری طرف وہ تھے جو اس کی مخالفت کر رہے تھے اور سرے ہی سے ریزرویشن کو ختم کرنے کے حق میں ایجی ٹیشن کر رہے تھے۔ ہر جانب بہت ہنگامہ ہوا، سرکاری جائیداد، بسیں اور عمارتیں نذر آتش کی گئیں۔ کئی روز دنگوں اور کرفیو کی وجہ سے کام کاج ٹھپ رہا یہاں تک کہ کچھ لڑکوں نے خود کو آگ لگائی۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انھوں نے اپنی مرضی سے آگ لگائی یا انھیں اجتماعی جبر کا شکار ہونا پڑا البتہ سچ تو یہی ہے کہ ان طلبہ نے اپنی قیمتی

جائیں مکار و موقع پرست سیاست دانوں کے لیے گنوائیں اور وہ بھی اس گھناونے طریقے سے۔ بھاسکر ان احتجاجی جلوسوں اور جلسوں کے بارے میں اخباروں میں پڑھ کر اور ٹیلی ویژن پر دیکھ کر بہت ہی پریشان ہو گیا۔ حالانکہ وہ خود بھی سماجی ناانصافی کے خلاف اور سماجی مساوات کا پرستار تھا مگر اس کو اس طریقۂ کار سے سخت نفرت تھی جو عیار سیاست دانوں کو ان کے مذموم مقاصد حاصل کرنے میں مدد کرتا مگر پچھڑے ہوئے طبقوں کو کسی بھی صورت میں فائدہ نہیں پہنچا سکتا تھا۔

ان تشدّد آمیز مظاہروں کی بنیادی وجہ یہ نہیں تھی کہ درجہ فہرست ذاتوں اور قبیلوں کو سرکاری نوکریاں اور پیشہ ورانہ کالجوں میں ریزرویشن نہیں مل رہی تھی۔ یہ سہولتیں تو ہندوستانی آئین میں ابتدا ہی سے دستیاب ہیں حالانکہ ان کی فراہمی میں دس سال کی حد مقرر کی گئی تھی اور ہر وقت اس کی تجدید کراتے وقت احتجاجی آوازیں بلند ہوتی تھیں۔ تیس سال کے بعد بھی یہ ریزرویشن ختم نہیں کی گئی تھی۔ شمار کیا جائے تو سرکاری نوکریوں میں ان ذاتوں اور قبیلوں کی حصے داری بہت بڑھ چکی ہے مگر ان فرقوں کی بے لگام بڑھتی ہوئی آبادی کے سبب ان کی شرح فیصدی آج بھی صرف نام کے لیے ہے۔ یہ لوگ نہ تو خاندانی منصوبہ بندی کی تعمیل کرتے ہیں اور نہ ہی مالی بدحالی کی وجہ سے اپنے درجن بھر بچوں کو تعلیم دلا سکتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جتنے ہاتھ اتنی آمدنی ہو گی چاہے وہ کیسے بھی ہو۔ دراصل ان مظاہروں کی بنیاد وزیر اعظم راجیو گاندھی اور اس کے وزیر خزانہ اور بعد میں وزیر دفاع وی پی سنگھ کے درمیان رسہ کشی تھی۔ وی پی سنگھ نے بطور مالیاتی وزیر کے طور پر بڑے بڑے صنعت کاروں کو آڑے ہاتھوں لیا تھا جس کی وجہ سے اُس کو خمیازہ بھگتنا پڑا۔ بعد میں بطور وزیر دفاع کے طور پر انھوں نے راجیو گاندھی کو بوفورس گھوٹالے میں ملوث ہونے کا الزام لگایا۔ وی پی سنگھ اقلیت میں ہوتے ہوئے بھی دوسری پارٹیوں کی بیساکھیوں کی مدد سے وزیر اعظم بن گئے۔ اپنے نجی فائدے کے لیے اس نے تاریخی محافظ خانہ سے 'منڈل کمیشن' کا اگن بم نکالا اور سارے ملک میں ریزرویشن کے نام پر آگ لگا دی۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس سے بہت پہلے بھاسکر بھاردواج کو ذات کی بنا پر نامنظوری راس نہ آئی ۔وہ استرداد کے کڑوے گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔اس نے اپنی تعلیمی قابلیت کو آگے بڑھانے کا عزم کرلیا۔گریجویشن میں چونکہ بہت اچھے نمبرات حاصل کیے تھے اس لیے اسے آسانی سے ایک نامور یونیورسٹی میں ایم اے اِکانومکس میں داخلہ مل گیا۔اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔وہ یونیورسٹی کے ہوسٹل میں رہنے لگا۔یونیورسٹی کا ماحول ابتدا میں اسے عجیب سا لگا مگر بعد میں وہ اسے مانوس ہوگیا۔

اس یونیورسٹی کا اپنا ایک انفرادی مقام ہے۔جب اس کی بنیاد ڈالی گئی اس کی کارکردگی عام یونیورسٹیوں سے الگ تھلگ رہی۔اس جامعہ کی فلاسفی میں یکتائی ہے،ماحول یساریت پسند ہے،سیکولرازم اور سوشلزم کو ترجیح دی جاتی ہے اور قومیت کے محدود نظریے کو رد کیا جاتا ہے۔یہاں پر طلبہ کو خیالات کے اظہار کی کھلی آزادی ہے۔اس جامعہ سے فارغ التحصیل طلبہ نہ صرف ملک کے اندر بلکہ غیر ممالک میں بھی اپنا لوہا منوا چکے ہیں ۔یونیورسٹی میں چند اسٹوڈنٹ یونینیں فعال ہیں لیکن بائیں بازو کی یونین مقبول ترین ہے۔وقت کے ساتھ یہاں کے ماحول پر مارکسی نظریہ غالب ہوتا گیا۔جامعہ کی تاریخ جدوجہد سے بھرپور رہی ہے۔یہاں کی ماؤوادی یونین نے ایک زمانے میں دانتے واڑہ،چھتیس گڑھ میں سی آر پی ایف پر کیے گئے نکسلی حملے کو،جس میں ۷۶ رجوان مارے گئے تھے،جائز ٹھہرایا۔سرکار کی جانب سے تعلیم کو زعفرانی رنگ میں رنگنے کی کوشش کے خلاف بھی مہم چلائی گئی۔علاوہ ازیں ہم جنس پرستی کے تحت جنسی آزادی اور شناخت کے حق میں تحریک کا انعقاد کیا گیا۔حد تو تب ہوئی جب کیمپس میں کشمیری انتہا پسندوں کی حمایت میں زبردست ہنگامہ ہوا اور مظاہرہ کرنے والے طلبہ نے اپنے ہی ملک کے خلاف نعرے بازی کی جس نے ملکی و غیر ملکی ردِعمل کو دعوت دی۔کیمپس میں کئی بار تشدّد کی وارداتیں بھی وقوع پذیر ہوئیں ۔ظاہر ہے کہ اس جامعہ میں ایک الگ ہی ماحول ہے جہاں انسانی حقوق،مساوات اور سرمایہ داری کے خلاف ذہن تیار کیے جاتے ہیں اور وہ وقتاً فوقتاً اپنا اظہار ڈھونڈ لیتے ہیں۔

جن دنوں بھاسکر یونیورسٹی میں تعلیم پا رہا تھا، یہاں کا ماحول بہت ہی پُرسکون، عملی اور ترقی پسند ہوا کرتا تھا۔ نہ کوئی شورش اور نہ ہی کوئی احتجاج۔ بس یونیورسٹی الیکشنوں کے دوران یونینیں آپس میں بھڑ جاتی تھیں۔ چنانچہ بھاسکر بھاردواج نچلے طبقہ سے تعلق رکھتا تھا اور سماج کا ٹھکرایا ہوا تھا اس لیے اس کو یہاں کا ماحول بہت ہی پسند آیا۔ وہ ابتدا ہی میں بائیں بازو والی یونین سے منسلک ہو گیا اور ہر اس تحریک کا حصہ بن گیا جو سرمایہ داری، ذات پات اور مذہبی منافرت کے خلاف ہوتی تھی۔ تاہم اس کی یہ غیر نصابی دلچسپیاں اس کی تعلیم میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتی تھیں۔

اقتصادیات ایک ایسا مضمون تھا جس نے بھاسکر بھاردواج کی آنکھیں کھول دیں۔ دنیا کا معاشی نظام کیسے چل رہا ہے اور کس طرح سرمایہ داروں نے معیشت کو اپنی کٹھ پتلی بنا کر رکھا ہے، اسے اچنبھا ہو جاتا۔ مارکسی نظریۂ حیات، سرمایہ دارانہ نظام کی بیخ کنی اور سماجی مساوات کی بحالی نے اس کو غور و فکر کرنے کے لیے اُکسایا۔ وہ دن رات سوچتا رہتا کہ اس کا معاشرہ کس طرح بدل سکتا ہے۔ کبھی مارکسی یونین کا عہدہ دار بن گیا، کبھی کمیونسٹ پارٹی کا فعال رکن بن گیا اور کبھی نکڑ ناٹکوں میں حصہ لیتا رہا مگر نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ بس وہی ڈھاک کے تین پات...! اس کا دیش مخالف سمت میں بہت آگے نکل چکا تھا۔

اشتراکیت سے قربت نے ملکی کمیونسٹ رہنماؤں کی اصلیت بے نقاب کر دی۔ مارکس، اینجلز اور لینن کی کتابیں پڑھ کر بھاسکر کو یقین ہو گیا تھا کہ اشتراکیت پسند ایک مساوی سماج کے خواہاں ہیں اور امیر و غریب کے درمیان کی خلیج کو پاٹنے کے کوشاں۔ اس نے یہ بھی پڑھا تھا کہ کمیونسٹ سوسائٹی میں مذہب کی کوئی جگہ نہیں۔ چنانچہ اس نے کارل مارکس کا یہ قول کئی بار پڑھا تھا کہ "مذہب لوگوں کے لیے افیم ہے۔" غرض اشتراکی معاشرے میں مذہب کا کوئی رول نہیں ہے کیونکہ یہ ایک ایسا نظریہ ہے جس کے مطابق تمام انسان سماجی، سیاسی اور تعلیمی نشو و نما میں برابر کے حق دار ہیں۔ مگر زمینی حقیقت کچھ اور تھی۔ اس نظریے کے معتقد اکثر و بیشتر غریب لوگ تھے جنھوں نے سرخ کتاب کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ وہ اشتراکیت کے حامی اس

لیے بنے ہوئے تھے کہ انھیں یقین دلایا گیا کہ جب انقلاب آئے گا تو نہ امیر رہے گا اور نہ غریب ، دونوں ایک سمان ہوں گے۔ غریبوں کو زندگی کی بنیادی ضروریات آسانی سے دستیاب ہوں گی اور انھیں ان کے لیے مزید کوئی جدوجہد نہیں کرنی پڑے گی۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہوگیا کہ برصغیر میں اشتراکیت پسندوں نے اپنے مذاہب سے پل بھر کے لیے بھی ناتا نہیں توڑا اور وہ مذہب کے معاملے میں اتنے ہی روایت پسند ہیں جتنے ان کے اسلاف۔ بس ایک ہی خواب پال رکھا ہے انھوں نے اور وہ ہے آسانی سے روٹی ، کپڑا اور مکان حاصل کرنے کا۔ یہاں بھی انھیں یقین ہے کہ انقلاب کے کامیاب ہوتے ہی خدا ان کو منّ وسلویٰ کی مانند ان نعمتوں سے مالامال کردے گا۔ اشتراکیوں کے چہرے اس وقت بے نقاب ہوئے جب انھوں نے راتوں رات اپنا رنگ بدل دیا۔ آزادی سے پہلے اشتراکیت پسندوں کا بہت بڑا گروہ فعال تھا جس میں ہندو مسلم سکھ عیسائی سبھی شامل تھے مگر جب آزادی کا اعلان ہوا اور تقسیم وطن کی نوبت آئی تو مساوات اور مذہبی غیر جانبداری پر یقین رکھنے والے اکثر مسلم اشتراکی دانشور سرحد پار کر کے مملکت خداداد پاکستان چلے گئے اور ان کے رفقا ہندو اشتراکی سرحد کے اس پار آ گئے۔

آزادی کے بعد چند رہنماؤں نے کمیونزم کا چولا تو پہن رکھا تھا مگر اس تحریک سے بدظن ہو گئے تھے۔ حالانکہ خود وہ سوشلزم کے اصولوں پر عمر بھر کاربند رہے مگر ان کے پیرو اور بال بچے ان کے خیالات پر ہنستے رہے۔ ان کی اولاد نے اپنے اثر ورسوخ کی وجہ سے ہندوستان کے بہترین تعلیمی اداروں سے ڈگریاں حاصل کر لیں اور پہلی فرصت میں اعلیٰ تعلیم پانے کی خاطر کمیونسٹ ممالک کی بجائے سرمایہ دارانہ ممالک جیسے امریکا، انگلستان، فرانس اور جرمنی کی راہ لی۔ پھر وہیں مستقل قیام کیا۔ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے کئی ٹکڑے ہو گئے، کوئی گروہ خود کو اعتدال پسند کہلاتا، کوئی گروہ مارکس کا اصلی نمائندہ کہلاتا اور کسی گروہ نے باضابطہ ہتھیار اٹھا کر سرمایہ دارانہ نظام سے لوہا لینے کا اعلان کر دیا۔ آخرالذکر پارٹی تب سے خون کی ندیاں بہانے میں مصروف رہی ہے مگر اب تک ان کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا۔ دوسری جانب کمیونسٹ

رہنماؤں نے اپنی ساکھ مٹتے دیکھ کر میانہ رو پارٹیوں سے سانٹھ گانٹھ کر لی اور انہی کی بیساکھیوں کے سہارے اب تک سانس لے رہے ہیں ورنہ سارے ملک میں اب ان کا اثر صفر کے برابر ہو گیا ہے۔ دنیاوی منظر نامے پر جوں ہی بھاسکر کی نظر دوڑتی تو وہاں بھی قنوطیت کے بادل ہر طرف چھائے ہوئے تھے۔ سوویت یونین ٹوٹ پھوٹ کی کگار پر تھا اور سوویت اتحاد سے جڑے ممالک جیسے چیکوسلوویکیا، پولینڈ، جرمن ڈیموکریٹک رپبلک، رومانیہ، منگولیا، ویٹ نام، بلگیریا، کیوبا وغیرہ ان بیڑیوں سے آزاد ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ جرمنی میں برلن دیوار گرادی گئی اور مغربی و مشرقی جرمنی ایک ہو گئے جہاں اب سرمایہ دارانہ نظام قائم ہے۔ محسوس ہو رہا تھا کہ کمیونزم کا محل تاش کے پتوں کی طرح ڈھنے والا ہے۔ ان واقعات نے بھاسکر کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔

یونیورسٹی کے ماحول نے بھی بھاسکر کو آزردہ کر دیا۔ طلبہ میں بے راہ روی اور منشیات کی لت عام تھی۔ اس طرز زندگی کو طلبہ انفرادی آزادی سے تعبیر دیتے تھے۔ وقتاً فوقتاً طلبہ نشہ آور پارٹیاں کرنے میں مصروف ہو جاتے اور ان پارٹیوں میں ناچ گانے کے علاوہ شراب اور منشیات کا استعمال ہوتا۔ بھاسکر کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ ایسی آزادی کس ترقی پسند سماج کی طرف لے جا رہی ہے۔ نوجوانوں میں نشے کی لت تو بہت ہی شرمناک اور قابل مذمت فعل ہے۔ ان سبھی باتوں سے بھاسکر، جو بڑی امیدیں لے کر اس یونیورسٹی میں داخل ہوا تھا، مایوس ہو گیا اور اس نے اپنی پڑھائی جوں توں مکمل کرنے کا قصد کر لیا۔ تاہم جب کبھی مایوسی غلبہ پاتی تو وہ اپنے پرانے کالج کے خوبصورت ایام میں کھو جانے کی کوشش کرتا اور سُچیتا کے ساتھ گزاری ان گھڑیوں کو یاد کرتا جب وہ دنیا و مافیہا سے بالکل گوشہ گیر ہو جاتا۔

(۱۶)

اس پس منظر میں بھاسکر بھاردواج نے اپنے لیے دوسرا ہی راستہ چن لیا، اس نے اقتصادیات میں پوسٹ گریجویشن کے بعد آئی آئی ایم، احمد آباد سے ایم بی اے کی ڈگری

حاصل کرلی اور دو سال تجربے کی خاطر ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرکے اینجل سرمایہ کار (Angel investor) اور بنک قرضے کی مدد سے اپنی ایک نجی کمپنی کھولی۔ کمپنی ملبوسات (Garments) اور دستکاریاں (Handicrafts) برآمد کرتی تھی اور نہ صرف اپنی فیکٹریوں میں پوشاکیں سلواتی بلکہ باہر بازار میں بھی اہل ہنر کو کام سونپ دیتی۔ دو ایک فیشن ڈائزائنروں کو بھی ملازم رکھا گیا جو نئے سے نئے ڈائزین کے کپڑے بنواتے جنھیں مارکیٹ میں فروخت کرنا آسان ہو جاتا۔ اس کے علاوہ بھاسکر نے سوتی کپڑا بنانے کا کارخانہ بھی نصب کیا جس کا تیار شدہ مال اس کی گارمنٹ فیکٹری کے لیے کچا مال سپلائی کرتی تھی۔ چند ہی برسوں میں اس کی کمپنی 'سویتا انٹر پرائزز' نے پانچ کروڑ کی بکری کا ریکارڈ قائم کیا۔ چنانچہ کچھ برسوں کے بعد ملک میں زور وشور سے کمپوٹر کا استعمال ہونے لگا بھاسکر کو اس میں اپنی بزنس کی توسیع کے لیے ایک بہترین موقع نظر آیا۔ اس نے خود کمپوٹر سافٹ وئیر کی ٹریننگ حاصل کی اور بعد میں تین کمپوٹر انجینئروں اور آپریٹروں کی بھرتی کرکے سافٹ وئیر کمپنی بھی کھولی جو دیکھتے ہی دیکھتے کامیابی کی منزلیں طے کرنے لگی۔

سویتا اس کی ماں کا نام تھا جس کے نام پر نہ صرف اس نے ایک کمپنی کھولی تھی بلکہ ایک چیرٹیبل ٹرسٹ بھی قائم کیا تھا۔ اسے وہ دن یاد تھے جب اس کے ماں باپ نے روکھی سوکھی کھا کر اس کو تعلیم دلوانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس نے کئی بار ماں کو فاقہ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ والد ایک چمڑے کی فیکٹری میں کام کرتا تھا کیونکہ اس کو چمڑے کی دباغت میں مہارت حاصل تھی۔ حالانکہ وہ جاٹو ذات سے تعلق نہیں رکھتا تھا لیکن بے روزگاری سے مجبور ہو کر اس نے یہ کام سیکھ لیا تھا۔ دہاڑی جو بھی مل جاتی اپنی شریک حیات کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔ وہ جانے اور اس کی فہم۔ مگر سویتا نے اپنے خاوند کی اس بے کنار محبت کی قدر کی اور ہر پیسے کا صحیح طور استعمال کیا۔ بیٹے کی پڑھائی پر خوب دھیان دیا اور اس کو اٹھتے بیٹھتے یاد دلاتی رہی کہ اس کے والدین اپنا پیٹ کاٹ کر اس کو پڑھا رہے ہیں اس لیے اس کا فرض بنتا ہے کہ ان کی لاج رکھے۔ اپنے ماضی کو یاد کرتے ہوئے اسے ہمیشہ غریبوں اور پسماندہ طبقوں کا خیال رہتا۔ وہ

حتی الامکان کوشش کرتا کہ جہاں تک ہو سکے زیادہ سے زیادہ کام ہاتھ سے کرائے اور ناگزیر حالات میں ہی مشینوں کا استعمال ہو۔

بھاسکر بھاردواج کے کانوں میں جونہی اس بات کی بھنک پڑ گئی کہ بھوانی پور اور اس کے گردونواح میں سوکھا پڑ گیا ہے تو وہ بہت بے قرار ہو گیا۔ ہر روز ریڈیو اور اخباروں میں خبریں شائع ہو رہی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ سُچیتا نے وہیں پر ایک یتیم خانہ کھول رکھا ہے۔ اُسے سُچیتا کی پل پل کی خبر رہتی تھی مگر نہ تو سامنے آتا اور نہ ہی اس کو کانوں کان خبر ہونے دیتا۔ بھاسکر سے رہا نہ گیا اور اس نے خود ہی بھوانی پور جا کر حالات کا جائزہ لیا۔ وہاں خفیہ طور پر احتیاط کے ساتھ سُچیتا راٹھور کے بارے میں دریافت کیا۔ ماضی میں سُچیتا پر جو کچھ گزری تھی اس کے بارے میں کچھ کچھ تو جانتا تھا مگر اب اسے پورا حال معلوم ہوا جس نے اس کو بہت اُداس کر دیا۔ ساتھ ہی اس کو یہ بھی معلوم ہوا کہ سُچیتا نے اپنی زندگی سماج سیوا کے لیے وقف کر لی ہے اور نہ صرف ایک یتیم خانہ چلا رہی ہے بلکہ گاؤں میں سوکھے کے باعث ہوئی تباہی کا مقابلہ کرنے اور بچاؤ کی تدبیریں کرنے کے لیے وہاں کی عورتوں کو منظّم کر رہی ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کام کے لیے سُچیتا نے کئی صنعت کاروں سے مالی امداد دینے کی درخواست کی ہے۔ بھاسکر بھاردواج نے اپنے ذرائع سے وَردان آشرم کے بنک اکاونٹ کا پتہ لگوایا اور پھر واپس جا کر ہر مہینے اُس میں سویتا چیریٹیبل ٹرسٹ کے نام سے پیسے بھیجتا رہا۔ اس نے بنک کو ہدایت دی تھی کہ اس کی شناخت کسی بھی طرح ظاہر نہیں ہونی چاہیے۔ اتنا ہی نہیں اس نے اپنی کمپنی کے ایک تربیت یافتہ منیجر رنبیر چوہان کو، جس پر اس کو پورا بھروسہ تھا، یہ کہہ کر سُچیتا راٹھور کے گاؤں بھیج دیا کہ نہ تو وہ اپنی شناخت ظاہر کرے گا اور نہ ہی کمپنی کے ساتھ وابستگی۔ بھوانی پور پہنچ کر رنبیر گھریلو اور چھوٹی صنعتیں قائم کرنے اور ان سے وابستہ دیگر کاموں میں سُچیتا کا ہاتھ بٹانے میں مدد کرتا رہا اور سُچیتا راٹھور کو اس بات کی کانوں کان خبر نہ ہونے دی کہ اس کو کس نے بھیجا ہے۔ حالانکہ گاہے بہ گاہے سُچیتا کے دماغ میں یہ سوال ضرور اٹھتا کہ اس آدمی کو ہمارے بارے میں کیسے علم ہوا، یہ کون ہے اور کیوں اس طرح ہماری مدد کر رہا ہے؟ بہرکیف

اس نے ان باتوں پر زیادہ غور نہیں کیا۔ وقت تیز رفتاری سے رینگتا چلا جا رہا تھا۔

(۱۷)

ایک روز ایک خاتون سُچیتا راٹھور سے ملنے اس کے دفتر میں چلی آئی۔ سُچیتا اپنے کمرے میں کسی کام میں مگن تھی کہ خاتون پر نظر پڑتے ہی اچھل پڑی۔ سُچیتا نے اس کو ایک ہی نظر میں پہچان لیا اور کھڑے ہو کر گرم جوشی سے گلے لگا لیا۔ پھر واپس اپنی کرسی پر بیٹھ گئی اور زبیدہ اختر اس کے روبرو کرسی پر براجمان ہو گئی۔

''زوبی، تم نے تو مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ اتنی مدت بعد کہاں سے ٹپک پڑی؟''

''سچی، دراصل میں کچھ ذاتی معاملات میں الجھ گئی تھی اور سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آگے کیا کروں۔ تمھارے بارے میں اِدھر اُدھر سے خبریں ملتی رہتی تھیں اس لیے تم سے ملنے کو بہت جی چاہتا تھا۔ کالج کے بعد آج تم سے ملنے کا موقع مل گیا۔ میں نے سنا ہے کہ تم نے سماج سیوا کے کاموں میں کافی پیش رفت کی ہے۔ ہر طرف تمھارا چرچا ہو رہا ہے۔ مجھے تو سن کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ سنا ہے تم نے ایک یتیم خانہ کھول رکھا ہے اور آس پاس کے گاؤں کی خواتین کو منظّم کر کے ان کے لیے معاشی کفالت کی راہیں استوار کی ہیں۔ اور پھر تم نے ماحولیاتی تحفظ کے لیے بھی بہت کام کیا ہے۔ دراصل مجھے کالج ہی میں تمھارے خیالات سن کر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ پڑھائی تو بہانہ ہے، تم نے اپنی کمند دور ستاروں پر ڈال رکھی ہے۔ سچی، وہ بھی کیا دن تھے جب میں اور تم سوشیولوجی کلاس میں پروفیسروں کی بولتی بند کیا کرتے تھے۔ وہ زمانہ ہی کچھ اور تھا۔ اب تو عملی زندگی کا مزہ چکھ کر میرے پر ہی ٹوٹ چکے ہیں اور میں فرار کی راہیں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔''

''تم اور فرار.....! یہ بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی ہے۔ تم ہمیشہ عملی ٹائپ کی لڑکی ہوا کرتی تھی۔ تم تو کہتی تھی کہ میں اپنی قوم کی خواتین کو ناخواندگی، نرینہ عصبیت اور توہم پرستی کے چنگل

سے آزاد کرنا چاہتی ہوں۔ پھر آج یہ کونسی بولی بول رہی ہو؟''

''یہی تو رونا ہے سچی۔ میرے والد عالم و فاضل تھے مگر انھوں نے کبھی اس کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا۔ ان کے دل میں رجائیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ انھوں نے مجھے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے کبھی نہیں روکا۔ خود انھوں نے کئی مذاہب کی مقدس کتابوں کا غور سے مطالعہ کیا تھا اور چاہتے تھے کہ میں بھی تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو جاؤں۔ انھوں نے سماج کی فکر نہ کر کے مجھے اسکول اور کالج بھیج دیا۔ میں نے انھیں کبھی کسی مذہب کی برائی کرتے ہوئے نہیں سنا۔ چاہتے تھے میں کسی کالج میں پروفیسر مقرر ہو جاؤں اور علم کی روشنی پھیلاؤں۔ لیکن قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ کالج سے نکلتے ہی میرے والد جنت نشین ہو گئے اور ماں نے میری مرضی کے خلاف ایک رشتے دار کے بیٹے بشارت علی سے میری شادی کر دی۔ کہنے کو تو وہ خاندانی رئیس تھا مگر چال وچلن سے بہت بگڑا ہوا تھا۔ جیسے ہمارے ہاں رواج ہے، میں نے اس وقت زبان سے اُف تک نہیں کی۔ بکری کی مانند مذبح خانہ کی طرف چپ چاپ بڑھتی چلی گئی۔ بشارت صرف بارہویں پاس تھا اور موروثی دھندے میں والد کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ دولت کی ریل پیل تھی۔ میرے مرحوم والد کا رشتے دار تھا اس لیے ماں کو کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوئی۔ یوں بھی ہماری قوم میں رشتے داری میں ہی شادیاں ہوتی ہیں حالانکہ علم حیاتیات کی رو سے یہ رسم سراسر غلط ہے اور اس کے سبب کئی جینیاتی بیماریاں، جو عام طور پر دبی رہتی ہیں، اپنا سر ابھارتی ہیں اور آنے والی نسل کو اس کا انجام بھگتنا پڑتا ہے۔

خیر نکاح تو ہو گیا مگر دونوں کے سوچنے کا ڈھنگ بالکل مختلف تھا۔ دونوں کے خیالات کی پرواز الگ الگ تھی۔ ہوتی کیوں نہیں؟ میں پڑھی لکھی، روشن ذہن، انسانی قدروں کی پاسدار اور سادہ زندگی گزارنے کی خواہش مند تھی۔ میں چاہتی تھی کہ زندگی میں کچھ ایسا کام کروں جو انسانیت کے لیے قابل قدر ہو۔ اس کے برعکس وہ کم تعلیم یافتہ اور مادیت پسند تھا، بس پیسے اور صرف پیسے کی رٹ لگا رکھی تھی، اس کے لیے تو عیش وعشرت کے سوا زندگی کا اور کوئی مقصد نہیں تھا۔ نہ تو کبھی اس کے ساتھ انٹلکچول گفتگو ہو سکتی تھی اور نہ ہی زندگی کے اعلیٰ اقدار

کے بارے میں خیالات کا تبادلہ۔ خود تو وہ باہر عیش کرتا تھا، سگریٹ اور شراب پیتا تھا مگر گھر میں قدامت پسند اور محتاط بنا پھرتا تھا۔ دوشاخہ شخصیت کی بہترین مثال تھا وہ...! میں نے اسے کبھی نماز پڑھتے یا روزہ رکھتے ہوئے نہیں دیکھا مگر مذہب کے بارے میں اس طرح باتیں کرتا تھا جیسے بہت بڑا عالمِ دین ہو۔ اس نے نکاح کے بعد مجھے نوکری کرنے سے صاف منع کر دیا اور مجھے گھر کی چار دیواری میں قید کر دیا۔ دن بھر سوچتی رہتی تھی کہ میں نے تعلیم حاصل کرنے کے لیے کیوں اتنی مغزماری کر لی، اتنی محنت کا کیا صلہ مل گیا۔ بشارت کی دوہری شخصیت کو دیکھ کر مجھے چند ہی مہینوں میں اسے نفرت ہونے لگی۔ اس پر طرّہ یہ کہ اس نے دبئی میں اپنی دکان کھول لی اور پھر وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ بشارت خال خال ہی مجھے دیکھنے کے لیے ہندوستان چلا آتا۔ وہ بھی چند دنوں کے لیے اور اس کے بعد مجھے پھر وہی تنہائی کاٹنے کو دوڑتی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ مجھ سے کس بات پر اتنا خفا ہے اور میں اس کو اپنا بنانے کے لیے اور کیا کر سکتی ہوں؟

کچھ عرصہ بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس کا کہیں اور معاشقہ چل رہا ہے اور وہ لڑکی ٹیلی ویژن آرٹسٹ ہے۔ ان کی ملاقات دبئی میں کسی شوٹ کے دوران ہوئی تھی اور پھر وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب آئے کہ ازدواجی بندھن میں بندھنے کی نوبت آئی۔ ان دنوں ہمارے یہاں طلاق دینا بہت ہی آسان بات تھی، آدمی فون پر بھی تین طلاق کہہ کر چھٹکارا پا سکتا تھا۔ مہر کو چھوڑ کر نان ونفقہ کی ذمے داری اس پر عائد نہیں ہوتی تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ اس نے ایک روز مجھے فون پر طلاق دے دی۔ طلاق... طلاق... طلاق... ان تین الفاظ کو سن کر میرے ہوش و حواس خطا ہو گئے۔ اس ناکام ازدواجی رشتے کے بارے میں میں نے بہت سوچا مگر آج تک اس معمہ کو حل نہیں کر پائی۔

اس واقعے کے بعد میں دل شکستگی اور ذہنی انتشار سے نڈھال ہو گئی۔ نہ کچھ کرنے کو جی کرتا تھا اور نہ کسی سے ملنے کو۔ یوں بھی شادی کے بعد اس نے مجھے نوکری کرنے سے اس لیے منع کیا تھا کہ اس کے خاندان میں اس وقت تک کسی عورت نے اکیلے گھر کی دہلیز کے باہر قدم نہیں رکھا تھا، نوکری کرنے کی تو بات ہی نہیں۔ سچ تو یہ تھا کہ اس کے خاندان میں اکثر و بیشتر

عورتیں جاہل اور ناخواندہ تھیں پھر وہ گھر کی دہلیز کے باہر کس لیے قدم رکھنے کی جسارت کرتیں۔ خیر میں اپنے میکے چلی گئی، مرحوم والدین کی اکلوتی بیٹی تھی اس لیے ان کی ساری جائیداد مجھے وراثت میں مل گئی۔ بہت عرصہ کے بعد میں کچھ حد تک سنبھل گئی۔ اس دوران ایک مقامی روزنامے میں تمھارے کارناموں کے بارے میں تفصیلی رپورٹ شائع ہوگئی جس کو پڑھ کر مجھے مزید سنبھلنے میں مدد ملی۔ تمھاری جدوجہد کو دیکھ کر میری رگوں میں تازہ خون دوڑنے لگا اور میں نے سوچا کہ تم سے ملوں اور اپنی زندگی کی ایک نئی شروعات کروں۔''

''زوبی، تمھاری کہانی سن کر بہت افسوس ہوا۔ دراصل ہمارا مشرقی معاشرہ ہی کچھ ایسا ہے کہ ہماری عورتیں محفوظ نہیں ہیں۔ قدم قدم پر انھیں بے ثباتی اور غیر محفوظیت کا احساس کچوکتا رہتا ہے۔ ہمارا مرد اساس مشرقی معاشرہ نرینہ عصبیت کا شکار ہے جس پر ہمارے مذہبی رہنما فخر کرتے ہیں، عام طور پر عورتوں کو دوسرے درجے کی مخلوق قرار دیا جاتا ہے اور یہ باور کرایا جاتا ہے کہ وہ مرد کی غلام بن کر ہی سکھی جیون گزار سکتی ہیں جبکہ تاریخ گواہ ہے کہ عورتوں نے جب بھی کسی میدان میں قدم رکھا ہے انھوں نے فتح کے پرچم لہرائے ہیں۔ نسائی فتح مندی کی ہزاروں مثالیں دی جاسکتی ہیں مگر ان سب کے بارے میں بتانے کے لیے بہت وقت درکار ہے اور پھر انسان کو انسائیکلوپیڈیا ہونے کی ضرورت ہے۔ البتہ چند ایسی خواتین کے نام گنوانا کافی سمجھتی ہوں جنھوں نے اپنا نام تاریخ کے اوراق میں سنہری الفاظ سے ہمیشہ کے لیے کندہ کیا ہے۔ حب الوطنی و دلیری کے میدان میں فرانس کی جون آف آرک، چین کی فوہاؤ، یونان کی آرٹمیز یا اور اولمپیاس، امریکہ کی سوسن بی اینٹنی اور ہیریٹ ٹبمین اور ہندوستان کی جھانسی کی رانی، رضیہ سلطانہ، اونا کے اوباوا، رانی ویلو ناچیار اور رانی ابا کا چوتا سر فہرست ہیں۔ مسلم خواتین جنھوں نے مختلف میدانوں میں نام کمایا ہے: زینب بن احمد (اسکالر)، رابعہ بصری (صوفی)، رفیدہ الاسلمیہ (طبیبہ)، شیریں عبادی (انسانی حقوق/ایران)، بیگم رقیعہ (حقوق نسواں/ بنگال) وغیرہ۔ اسی طرح کئی ایسی سائنس دان خواتین گزری ہیں جنھوں نے انسانی زندگی کو سنوارنے اور امراض سے بچانے میں حصہ لیا جیسے میری کیوری

(کیمیات)،فلورنس نائٹ انگیل (نرسنگ) ، ایڈا لولیس (ریاضی) ، میری اینگ (رکازیات) ، کیرولین ہیر شل (فلکیات) ،ایلزبتھ بلیک ویل (طب) ، لائز مائٹنر (نیوکلیر فزکس) ، ایلس بال (کیمیات)،ریچیل کارسن (حیاتیات) ،پیٹریسیا باتھ (امراض چشم) وغیرہ۔نوبیل انعامات کی فہرست پرنظر ڈالوتو بہت ساری خواتین اس میں شامل ملیں گی۔حال ہی میں لکھنؤ کی ایک خاتون ہاشمہ حسن کی کہانی اخباروں میں شائع ہوئی تھی جس نے ریاضی میں امتیازی نمبرات حاصل کر کے امریکہ کے جیمز ویب ٹیلی اسکوپ تک کا سفر مکمل کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مشرقی مرد عورت کو اپنا جنسی کھلونا سمجھتے ہیں اور مذہب کے حوالے دے کر اس کو دائمی بیڑیاں پہنانا چاہتے ہیں۔جیسے زہریلے سانپ خفیہ دفینے کی رکھوالی کرتے ہیں ویسے ہی ہمارے مذہبی رہنما ہمارے ضرر رساں سماجی اصولوں کی رکھوالی کرتے ہیں۔

ہندوستانی آئین کے مطابق ہندو مادہ اولاد کو اپنے والدین کی جائیداد پر اتنا ہی حق ہے جتنا کہ نرینہ اولاد کو۔تاہم کتابوں میں قانون قلم بند کرنا ایک بات ہے اور اس کی عمل درآمد دوسری بات ہوتی ہے۔ان سب کی جڑ نسوانی ناخواندگی اور معاشی محتاجی ہے۔غور سے دیکھو کھیتوں میں مردوں سے زیادہ عورتیں کام کرتی ہیں اس کے باوجود انھیں معاشی طور پر محتاج سمجھا جاتا ہے۔میرا ماننا ہے کہ جب تک ہماری عورتوں میں شرح خواندگی بڑھ نہ جائے اور انھیں معاشی آزادی نہ مل جائے تب تک خواتین کی یہی دُردشا ہوتی رہے گی۔

ظاہر ہے کہ جو لوگ خواتین کو محکوم و مجبور سمجھتے ہیں وہ دراصل اپنی قوم سے دغا کرتے ہیں اور قوم کی ترقی کے دروازے بند کرتے ہیں۔"

سُچیتا راٹھور کی باتیں زبیدہ اختر غور سے سن رہی تھی،اس کے بعد وہ گویا ہوئی۔

"ہاں یہ سچ ہے کہ ہماری تہذیب اور کلچر کی ترقی میں خواتین کا بہت بڑا رول رہا ہے جس سے انکار کرنا مشکل ہے۔مگر یہاں مشرقی ممالک میں قدامت پرست مذہبی رہنماؤں کا بول بالا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ عورت کو آزادی دینے سے ان کی اپنی فضیلت اور بالادستی میں کمی آجائے گی اور اس طرح ان کی حاشیہ سازی ہوگی۔خیر چھوڑو ان باتوں کو۔میں یہاں تم سے

صلاح لینے کے لیے چلی آئی ہوں۔''

''کہہ دو جو کچھ کہنا ہے۔ میں جہاں تک تمھاری مدد کر سکتی ہوں، کرنے کی کوشش کروں گی۔ البتہ تمھیں اپنے نصب العین کو پانے کے لیے خود ہی محنت کرنی پڑے گی، ہم جیسے لوگ تو صرف تمھارا سہارا بن سکتے ہیں۔''

''ہاں بہن یہی امید لے کر تو میں یہاں آئی ہوں۔ بات یوں ہے کہ تقسیم وطن کے بعد ہمارے بہت سارے رشتے دار ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے جبکہ میرے والد صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ وہ اپنی حویلی میں ڈٹے رہے۔ باوجودیکہ ان پر زمین مافیا نے کئی بار حملہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ساری زمین وجائیداد اپنے قبضے میں لے لی اور اس کو سنبھالتے رہے۔ چمڑے کا ایک کارخانہ لگایا جہاں بیسیوں کاریگروں کو روزگار مہیا کرتے رہے۔ ان کی فیکٹری کے جوتے، چپل اور سینڈل کافی مقبول ہو گئے اور ان کی بکری میں انھیں کوئی کٹھنائی محسوس نہ ہوئی۔ بٹوارے کا گرد و غبار جب تھم گیا تو میرے ابو نے اپنے رشتے داروں کو چھوڑ کر ایک انجان مسلم لڑکی سے شادی کر لی اور دونوں خوشی سے جیتے رہے۔ میں ان کی اکلوتی اولاد ہوں۔ یوں تو میرے پیدا ہونے سے پہلے ماں کے بطن سے دو اور بچے پیدا ہونے سے پہلے ہی رحمت حق ہو گئے تھے۔ دراصل ہمارا سماج دقیانوسی ہے۔ ہر بار جننے والی دائی کو بلایا جاتا کیونکہ سنا تھا اسپتال میں مرد گائنوکولوجسٹ تعینات ہے اور پردے کے باعث بزرگوں نے مرد ڈاکٹر سے معائنہ کرانے سے منع کر دیا۔ یہ تو اللہ کی مہربانی تھی کہ میں بچ گئی اور اب تک زندہ ہوں۔

گو عام خیال یہ تھا کہ لڑکی کو گھر میں مذہبی تعلیم دلوا کر کمسنی ہی میں اس کی شادی کروائی جائے مگر میرے ابو اس بات سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر لوں اور اپنی زندگی کے فیصلے خود ہی لوں۔ بدقسمتی سے وہ میری گریجویشن کے بعد ہی داغ مفارقت دے کر چلے گئے اور مجھے دلہن کے روپ میں بھی نہیں دیکھ پائے۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ میں یہاں پر اپنے آپ کو دہرانے جا رہی ہوں مگر کیا کروں مجبور

ہوں۔امید ہے کہ تم مجھے معاف کروگی۔ ماں توان پڑھ اور ضعیف الاعتقاد تھی، لوگوں کی باتوں میں آگئی اور مجھے ایک ایسے آدمی کے پلے باندھ دیا جو تعلیم کے لحاظ سے مجھ سے کم پڑھا لکھا تھا اور میرے ساتھ بات کرتے ہوئے بھی گھبرا جاتا تھا۔اس نے مجھے مزید تعلیم حاصل کرنے یا ملازمت اختیار کرنے سے روک لیا۔ میری ہم نوائی میں اس کا احساسِ کمتری روز بروز بڑھتا ہی چلا گیا۔ چونکہ اس کا بزنس اچھا چل رہا تھا، آمدنی بھی کافی ہو رہی تھی، اس لیے اس نے دبئی میں ہندوستانی قالینوں اور دست کاریوں کی دکان کھولی اور دھیرے دھیرے اس کا ہندوستان آنا جانا کم ہو گیا۔اس کے بعد اس نے ایک ٹی وی آرٹسٹ کے چکر میں پھنس کر مجھ سے علیٰحدگی اختیار کر لی اور مجھے طلاق دے دی۔ اس کے اس وتیرے کو دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا اور میں نے اپنی زندگی کا سفر از سرِ نو شروع کرنے کا ارادہ کر لیا۔

اتفاق سے چند سال پہلے ایک مقامی اخبار میں تمھاری زندگی پر لکھا ہوا ایک مضمون میری نظر سے گزرا۔ میں پڑھ کر بہت ہی متاثر ہوگئی اور مجھے اس مضمون سے تمھارے نقشِ قدم پر چلنے کی تحریک مل گئی۔ تمھاری زندگی سے تحریک پا کر میں نے بی ایڈ کا امتحان پاس کر لیا، پھر کچھ وقت کے لیے ایک اسکول میں نوکری کر لی اور بعد میں اپنی ہی حویلی میں ایک اسکول شروع کر لیا جہاں چند اور اساتذہ کو جمع کر کے مسلم لڑکیوں کو تعلیم دینے کا انتظام کر لیا۔ ابتدا میں تو بہت کم ریسپانس ملا مگر آہستہ آہستہ میری محنت رنگ لائی اور اب اس اسکول میں ماشااللہ دوسو کے قریب لڑکیاں تعلیم پا رہی ہیں۔"

"چمڑے کے کاروبار کا کیا ہوا؟"

"ابو کے مرنے کے بعد میں نے سوچا کہ اس کو بند کر دوں، چونکہ چمڑا سازی میں مجھے کوئی تربیت نہیں ہے اس لیے مجھے یہ زہر کا گھونٹ پینا پڑے گا۔ بہن، اس کے بارے میں سوچ کر میں رات بھر سو نہیں پاتی۔ اتنے سارے گھروں کے چولہے ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔ بیچارے کہاں جائیں گے؟ دریں اثنا میں نے ان کے سامنے ایک تجویز رکھی کہ اگر تم میں سے کوئی آدمی یہ کارخانہ چلا سکتا ہے، تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔ منافع سب کاریگروں میں بانٹ دیا

جائے گا۔ مگر کوئی بھی بندہ سامنے نہیں آیا۔'' زبیدہ اختر کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''پریشاں نہ ہو۔ مجھے اس کے لیے ایک حل نظر آ رہا ہے۔ تم ایک کمپنی منیجر رنبیر چوہان سے رابطہ کرلو، وہ میرے بھائی سمان ہے۔ اس کا میں تمھیں ایڈریس دے دیتی ہوں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ تمھاری مدد ضرور کرے گا۔'' سُچیتا نے ایک کاغذ کے پرزے پر رنبیر چوہان کا ایڈریس لکھ کر زبیدہ کو تھما دیا۔

''بہن، تم نے تو میرے دل پر سے بہت سارا بوجھ اُتار دیا۔ سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ اس کا شکریہ کن الفاظ میں کرلوں۔''

''اس میں شکریہ کی کیا بات ہے زوبی یہ تو میرا فرض ہے۔ خیر یہ بتاؤ کہ اب تمھارا کیا ارادہ ہے؟''

''دراصل ہمارے مسلم معاشرے میں ناخواندگی، توہم پرستی، نرینہ بالادستی، کم عمر میں نکاح کرنا اور خواتین کو نوکری کرنے سے باز رکھنے کا چلن بہت عام ہے۔ میں نے سماج میں بیداری لانے اور خواتین کو نرینہ جبر سے آزاد کرانے کا قصد کیا ہے۔ حویلی کے نزدیک ہی اسلام پورہ میں میری کافی موروثی زمین ہے اور چاہتی ہوں کہ اس زمین پر ایک اچھا سا اسکول تعمیر کروا کر اپنے خوابوں کی تعبیر پا سکوں۔''

''بہت اچھا خیال ہے زوبی۔ تم اپنی جائیداد میں سے وہ زمین مختص کرلو جس پر تم اسکول کھولنا چاہتی ہو۔ مستقبل میں توسیع کے لیے بھی گنجائش رکھ لینا۔ اس کے بعد اپنی حویلی اور بچی ہوئی زمین کو فروخت کرلو اور اسی سرمائے سے اسکول کی عمارت بنوالو۔ اپنی رہائش کا انتظام بھی ساتھ میں کرلینا، نہیں تو خود کہاں رہوگی۔ میں نے تو آشرم ہی میں اپنے رہنے کا انتظام کیا ہے اور میرے ساتھ مانسی موسی بھی رہتی ہے۔ وہ رشتے میں میری کچھ نہیں لگتی مگر سچ پوچھو تو خونی رشتے سے بھی بڑھ کر ہے۔ وہ میرے گاؤں میں پڑوس میں رہتی تھی۔ بیچاری نے بیٹی کی شادی دوسرے گاؤں میں کرلی اور بیٹا اسکول کی تعلیم مکمل کر کے بھاگ گیا اور پھر کبھی منہ نہیں دکھایا۔ تب سے وہ میرے کام میں مجھے ہاتھ بٹا رہی ہے اور مجھے اپنی بیٹی سے بھی زیادہ پیار کرتی ہے۔

اس کی وجہ سے مجھے اکیلا پن محسوس نہیں ہوتا۔ موسی کی انرجی دیکھ کر مجھے بارہا تعجب ہوتا ہے۔ ایک اَناتھ بچی کے والدین اور جائے پیدائش معلوم کرنے کے بارے میں اس نے میری بہت مدد کی۔ اب بھی جو کہیں کسی یتیم بچی کو دیکھتی ہے جس کا کوئی سہارا نہیں ہوتا تو اس کو فوراً یتیم خانے میں داخل کرنے کے لیے تگ و دو کرتی ہے۔ یتیم خانے کی نگرانی میں بھی وہ مجھے بہت مدد کرتی ہے اور وہاں کے اسٹاف پر بھی کڑی نگاہ رکھتی ہے۔ ایسی بے لوث عورت بہت ہی مشکل سے ملتی ہے۔''

''تم خوش نصیب ہو سُچی جو ایسی عورت کا ساتھ مل گیا ورنہ مجھے تو جو کوئی بھی ملا وہ میری دولت اور جائیداد ہڑپنے پر اُتارو تھا۔ کئی لوگوں نے تو رشتے داریاں نکال لیں اور چاہتے تھے کہ میں ان کی میزبانی کروں اور وہ میرے ساتھ حویلی ہی میں قیام کریں۔ چند ایک نے تو شادی کا پروپوزل بھی رکھا۔ کہتے ہیں نا کہ سانپ کا ڈسا رسی سے بھی ڈرتا ہے۔ میرے ساتھ جو بیتی تھی اس نے مجھے چوکنا کر دیا تھا۔ ماں باپ راستے ہی میں ساتھ چھوڑ گئے تھے، خاوند نے میری کشتی منجھدار میں ڈبونے کی کوشش کی تھی اور جب طلاق کے بارے میں سسرال والوں کو خبر ہوئی تو انھوں نے میرے ساتھ بات کرنی چھوڑ دی تھی۔ ساس، سسر، دیور، نند سب نے ایسے آنکھیں پھیر لیں جیسے نہ کبھی دیکھا تھا اور نہ ہی جانا تھا۔ علیک سلیک بھی بند ہو گئی۔ سچ پوچھو سچی میں تو ٹوٹنے کی کگار پر پہنچ گئی تھی۔ کئی بار خودکشی کا خیال ذہن میں آیا۔ سوچتی تھی اب کس لیے جینا ہے؟ کیا رکھا ہے اس دنیا میں میرے لیے؟ مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ میں سنبھل گئی اور مجھے اندر سے آواز آئی کہ انسان کی زندگی میں تو ایسی مصیبتیں آتی رہتی ہیں، ان سے ہار مان کر اپنی زندگی کھونا بزدلوں کا کام ہے۔ اسلام میں خودکشی جائز نہیں ٹھہرائی گئی ہے۔ زبیدہ، اٹھ کر ان کا مقابلہ کرو، ساری دنیا تمھارے سامنے ہے، ان کے لیے جیو اور ان کے لیے اپنی انرجی صرف کرو۔ ان ہی دنوں تمھاری مثال نے بھی تحریک دی۔''

''تم سچ کہہ رہی ہو زوبی۔ ہم دونوں کو ایک ہی طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ تمھیں شادی کے بعد یہ تلخ تجربہ ہوا اور مجھے شادی سے پہلے۔ تاریخ گواہ ہے کہ عورت ہمیشہ

طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرتی آئی ہے۔ چونکہ مقدس کتابیں نرینہ ذہن کی پیداوار ہیں اور خواتین نے نہ تو کوئی کتاب تحریر کی ہے اور نہ ہی ان میں درج کسی قانون کی تائید کی ہے، اس لیے سبھی قانون نسوانی حقوق کو نظر انداز کرتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ کئی صحیفوں میں عورتوں کو ڈھول سے مشابہ بتایا گیا ہے کہ جتنا پیٹو گے اتنا وہ نکھرے گا۔ غرض عورتوں کی پٹائی کو کئی مذاہب نے جائز ٹھہرایا ہے۔ یہ تو نرینہ سادیت کی حد ہے۔ اس حوالے سے ہمارے یہاں ہندوؤں میں کچھ ایسی روایات ہیں جن کا کوئی جواز ہی نہیں ہے۔"

"بہن، مسلمانوں میں بھی کئی رسم و رواج ایسے ہیں جن کا صحیفوں میں ذکر تک نہیں ملتا۔ پیغمبر کی منشا تھی کہ اسلام میں پوپ اور واٹِکان کی مانند کوئی ادارہ نہ ہو اور نہ ہی کوئی نیا قانون بنایا جائے۔ پوچھنے پر کہ ایسی صورت میں ہم کس سے رہنمائی حاصل کر لیں تو جواب ملا کہ پہلے تو قرآن میں مسئلے کا حل ڈھونڈ لو اور اگر وہاں نہ ملے تو سیرت النبی سے رہنمائی حاصل کر لو، تم بھی ویسے ہی مسئلے کو نپٹا لو جیسے پیغمبرؐ نے اپنے زمانے میں ایسے ہی مسئلے کو نپٹا لیا تھا۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خود ساختہ مذہبی رہنماؤں نے مذہب پر اجارہ داری قائم کر لی اور اپنے گرد ایک ہالہ بنا لیا کہ اسلام کے بارے میں ان کی رہنمائی ناگزیر ہے اور وہی قرآن کی صحیح تشریح کرنے کے قابل ہیں۔ اس طرح پادریوں کی مانند یہ مذہب بھی مولویوں کی گرفت میں آ گیا۔ انجام کار آئے دن فرمان جاری ہو رہے ہیں اور معمولی سی لغزش کو بے حرمتی کا ٹھپہ لگایا جا رہا ہے۔

موجودہ زمانے میں تواتر کے ساتھ نقل و حرکت ہونے کے سبب مشترکہ کنبے ٹوٹنے لگے ہیں۔ آزادی کے بعد ہندو عورتوں کو آئین کے مطابق میکے کی جائیداد پر مساوی حق دیا گیا مگر مسلم عورتوں کو اب بھی ایک تہائی حصہ تقسیم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح مرد تین طلاق دے کر اپنی منکوحہ سے چھٹکارا پا سکتا ہے جبکہ عورت ایسا نہیں کر سکتی ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ موجودہ سرکار اس حوالے سے قانون لانے کی خواہاں ہے۔ سب سے بڑی بدعت تو ہمارے معاشرے میں تعلیم کی کمی ہے۔ عورتیں تو اس سماج میں محض بچہ پیدا کرنے کی مشینیں بن گئی ہیں۔

دیکھا جائے تو جنسی نابرابری ہمارے ملک میں سبھی فرقوں میں پائی جاتی ہے۔ حال ہی

میں ہوئی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کے مسلمانوں میں سب سے زیادہ ناخواندگی (۴۳ ۴۲ر فیصدی) ہے، مردوں میں یہ شرح ۳۸ر فیصد ہے اور عورتوں میں ۴۸ر فیصد۔ غرض ہمارے یہاں مسلم عورتوں کو تعلیم سے محروم رکھا جاتا ہے۔ عورتوں کی یہ ناخواندگی سارے معاشرے کے لیے نقصان دہ ہے۔ ایک تعلیم یافتہ ماں ہی اپنے بچوں کو اچھی تربیت دے سکتی ہے اور انھیں اچھا شہری بنا سکتی ہے۔ لیکن جس معاشرے میں آدھی خواتین ناخواندہ ہوں اس کا تو خدا ہی حافظ ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ ناخواندہ ہونا ایک بات ہے اور تعلیم یافتہ ہونا دوسری بات۔ ایک شخص جو بنیادی تین ضرورتوں، پڑھنے، لکھنے اور حساب رکھنے، کی کچھ سُدھ بُدھ رکھتا ہو اسے خواندہ سمجھا جاتا ہے مگر تعلیم یافتہ وہ شخص ہوتا ہے جس نے کم سے کم ہائی اسکول کی پڑھائی ختم کی ہو اور نصابی مضامین میں قابلیت حاصل کی ہو۔ صاف ظاہر ہے کہ خواندہ ہونا اور تعلیم یافتہ ہونے میں زمین آسمان کا فرق ہے اور اس اعتبار سے تو یہ خلیج اور بھی بڑھ جاتی ہے نیز شرح فیصدی میں بھی کافی اضافہ ہو جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ میں گرلز اسکول کھولوں گی اور اپنے اور آس پاس کے گاؤں کی لڑکیوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کی کوشش کروں گی۔ مجھے احساس ہے کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے، مجھے ان پڑھ اور جاہل والدین کو قائل کرنا پڑے گا اور انھیں سمجھانا پڑے گا کہ یہ ان کی لڑکی، خاندان اور سماج کے لیے فائدہ مند رہے گا۔''

''بہت اچھی بات ہے۔ میری نیک خواہشات تمھارے ساتھ ہیں۔''

''نہیں دیدی، اتنے سے کام نہیں چلے گا۔ مجھے تمھاری مسلسل رہنمائی کی ضرورت پڑے گی۔ میں چاہتی ہوں کہ میں اسکول کے انتظامیہ کے لیے ایک ٹرسٹ کھولوں، جس میں تمھارا بھی نام بطور ٹرسٹی ہوگا، مجھے امید ہے تم انکار نہیں کرو گی۔ اس طرح مجھے تمھاری رہنمائی ہر مرحلے پر ملتی رہے گی۔''

''زوبی، ایسے فلاحی کام سے کون دور بھاگے گا۔ میں تو تمھارے ساتھ ہوں۔ تم شری گنیش تو کر لو۔''

زبیدہ اختر نے پہلی فرصت میں رنبیر چوہان سے ملاقات کی۔ خوش قسمتی سے اس سمئے وہ اپنے دفتر میں موجود تھا اور کسی سوچ میں غرق تھا۔ زبیدہ کو دیکھ کر وہ حیران ہوا کیونکہ ایک انجان چہرہ، جس نے بڑی بے تکلفی سے اپنا تعارف کرایا، اس کے روبرو تھا۔

''میرا نام زبیدہ اختر ہے اور میں سُچیتا راٹھور کی دوست ہوں۔ اس نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔''

''کہیے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

''دراصل میں ایک طلاق شدہ عورت ہوں اور اکیلی ہی اپنی زندگی کی لڑائی لڑ رہی ہوں۔ میرے والد کی ایک چمڑے کی فیکٹری ہے جو مجھ سے سنبھل نہیں پا رہی ہے، اس لیے میں چاہتی ہوں کہ اس کو کوئی اپنے ہاتھ میں لے تاکہ وہاں کے مزدور بے روزگار نہ ہو جائیں۔''

''اوہ، تو یہ بات ہے۔ آپ میرے ساتھ چلیے اور ہم اس کمپنی کے مالک سے بات کریں گے۔''

دونوں ایک ساتھ بھاسکر بھاردواج کے کمرے کی طرف روانہ ہوگئے۔ رنبیر پہلے کمرے میں داخل ہوا اور بھاسکر سے مخاطب ہوا:

''سر، ایک عورت آپ سے مدد لینے آئی ہے، اجازت ہو تو اندر لے آؤں۔''

''ساتھ ہی کیوں نہیں لائے۔ باہر کیوں انتظار کرایا؟''

رنبیر چوہان باہر نکلا اور زبیدہ کو لے کر واپس کمرے میں چلا آیا۔ بھاسکر پر نظر پڑتے ہی زبیدہ کو ایسا محسوس ہوا کہ اس شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے، مگر یاد نہیں آرہا تھا۔ اتنی دیر میں کرسی پر بیٹھا ہوا شخص اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔

''آداب، مجھے بھاسکر بھاردواج کہتے ہیں۔ میں اس کمپنی کا مالک ہوں۔ اور آپ؟''

''آداب۔ میرا نام زبیدہ اختر ہے اور مجھے سُچیتا راٹھور نے رنبیر صاحب کے پاس بھیج دیا

ہے۔وہ میری کلاس فیلو رہی ہے۔ مجھے اپنے ایک کارخانے کے بارے میں آپ سے صلاح لینی ہے۔'' وہ رُک گئی اور پھر تھوڑے وقفے کے بعد پھر بول پڑی۔ ''شاید آپ کو میں جانتی ہوں۔لگتا ہے کہیں دیکھا ہے اور پھر یہ نام بھی سنا سنایا سا لگتا ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے!''

''آپ کی کلاس میں ایک خاموش رہنے والا بھولا سا نوجوان ہوتا تھا جس کا آپ لوگ مذاق اڑایا کرتے تھے۔شاید یاد آجائے۔''

''ارے، آپ وہی بھاسکر ہیں۔قریباً بیس سال ہو گئے ہیں اس بات کو۔ پتہ ہی نہیں چلا۔آپ کی شکل وصورت میں کافی تبدیلی آچکی ہے۔''

''زبیدہ جی، آپ بھی تو بہت بدل گئی ہیں۔ وقت کے ساتھ سب کچھ بدل جاتا ہے۔ ہاں کہیے کہ مسئلہ کیا ہے؟''

''بھاسکر جی، میرے والد نے تقسیم وطن کے ٹائم پر پاکستان جانے سے منع کر دیا جب کہ ہمارے باقی رشتے دار سب چلے گئے۔ایک کوٹھی اور کچھ زراعتی زمین تھی جس کا انھوں نے خود ہی انتظام سنبھالا اور پھر کچھ دھندا کرنے کے لیے کمر کس لی۔ انھوں نے روایت کے مطابق رشتہ داری میں شادی نہ کر کے ایک اجنبی عورت کے ساتھ نکاح کر لیا اور میں ان کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ انھوں نے ایک چمڑے کا کارخانہ شروع کیا اور اس کو آہستہ آہستہ وسعت دیتے رہے۔اس کارخانے میں کافی لوگ کام کرتے تھے۔ جو جوتے، چپل اور سینڈل وہاں بنتے تھے وہ ہاتھوں ہاتھ بِک جاتے کیونکہ میرے والد کوالٹی کا خاص خیال رکھتے تھے اور کم منافع پر قناعت کرتے تھے۔خدا کی مہربانی سے روزی روٹی چل رہی تھی۔ پھر ان کا اچانک انتقال ہو گیا اور میری امی نے زبردستی میرا نکاح رشتے داری میں ایک کاروباری رئیس سے کر لیا جو میرے مقابلے میں کم پڑھا لکھا تھا اور دولت کا پجاری تھا۔ وہ شکم پرست اور لذتیت پرست تھا۔ ہماری زیادہ دیر نہیں بن پائی اور اس نے مجھے ایک ٹیلی ویژن آرٹسٹ کی خاطر طلاق دی۔ طلاق کے بعد میں واپس اپنے میکے چلی گئی۔ وہاں ممی کا انتقال ہو چکا تھا اور میں دنیا میں اکیلی رہ گئی۔ نہ کوئی آگے اور نہ کوئی پیچھے۔ چند دور کے رشتے داروں نے رابطہ کیا مگر

مجھے شک ہوا کہ انھیں میری بھلائی کی بجائے والد کے مال و دولت پر نظر ہے۔ کہتے ہیں ناں کہ سانپ کا ڈسا رسی سے بھی ڈرتا ہے۔ اس لیے میں نے سب سے کنارہ کرلیا اور زندگی کا سفر تنہا طے کرنے کی ٹھان لی۔ سُچیتا جی سے مشورہ کر کے میں نے کچھ جائیداد فروخت کرنے کا ارادہ کرلیا ہے اور بچی کھچی زمین پر ایک چھوٹا سا لڑکیوں کا اسکول کھولنے جا رہی ہوں۔ آج کل اسی تگ و تاز میں مصروف ہوں۔

اب میرے سامنے مسئلہ ابو کی چھوڑی ہوئی فیکٹری کا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اس کو کیسے سنبھالوں۔ نہ تو مجھے چمڑا بنانے کی کوئی جانکاری ہے اور نہ ہی جوتے وغیرہ بنانے کی۔ بہت سارے کاریگر کام کرتے ہیں۔ جیسے تیسے کام چل رہا ہے حالانکہ ابھی تک خسارہ ہو رہا ہے۔ لگتا ہے کہ آگے فیکٹری بند کرنی پڑے گی۔ میں نے فیکٹری میں کام کرنے والوں کو یہ تجویز دی تھی کہ اگر وہ اس فیکٹری کو خود چلا سکتے ہیں تو مجھے بہت خوشی ہوگی اور منافع جو بھی ہوگا سب میں بانٹ دیا جائے گا۔ مگر ان میں سے کوئی بھی آدمی تیار نہیں ہوا۔ اس لیے آپ کے پاس آئی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ میری نااہلی کے سبب ان بے چارے کاریگروں کے گھروں میں چولہے بجھ جائیں اور ان کے بال بچے بھوک سے تڑپتے رہیں۔ اگر آپ کوئی راستہ نکال سکتے ہیں تو میں ممنون رہوں گی۔"

اتنی دیر میں رنبیر نے چائے اور بسکٹ منگوائے اور تینوں گفتگو کے دوران چائے نوش فرماتے رہے۔

بھاسکر گہری سوچ میں پڑ گیا۔ پھر کہنے لگا۔ "زبیدہ جی، آپ کو حیرت ہوگی کہ میرے پِتا جی چمڑے کی دباغت میں ماہر تھے اور چمڑے کی کمائی کا کام عمر بھر کرتے رہے۔ میں بھی کئی بار ان کے ساتھ کارخانہ دیکھنے جاتا تھا۔ وہاں کی بدبو سے تو میں بہت پریشان ہو جاتا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پِتا جی سارے دن وہاں کیسے کام کرتے ہیں۔ تاہم میں نے وہاں ہو رہے کام کو پوری طرح دیکھ لیا اور سمجھنے کی کوشش بھی کی۔"

پھر وہ چائے کی چُسکیاں لیتا رہا اور سوچتا رہا۔ بہت سوچ بچار کے بعد بھاسکر نے زبیدہ

کومخاطب کیا۔

''میرے خیال میں آپ کے پاس اس مسئلے کو حل کرنے کے دو طریقے ہیں۔ایک، آپ اس کمپنی کو فروخت کیجیے اور جو کچھ بھی مل جاتا ہے وہ لے لیجیے اور اپنے کام میں اس کی سرمایہ کاری کیجیے۔فروخت کرنے کے لیے آپ مقامی اخبارات میں اشتہار دے سکتی ہیں۔دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ اس کمپنی کو برائے منیجمنٹ کسی کے سپرد کیجیے اور اس کو کمپنی میں حصص دے کر شریک بنالیجیے، وہ روزمرہ کا کام کاج دیکھتا رہے گا اور آپ بطور غیر کارگزار شریک رہیں گی۔آپ کو اپنے حصے کا منافع ملتا رہے گا۔''

''میں تو اس امید سے آئی تھی کہ آپ ہی اس کارخانے کا ذمہ اپنے ہاتھ میں لیں گے اور جو مناسب ہوگا وہ مجھے دیتے رہیں گے۔میرا مقصد یہ ہے کہ کارخانہ چلتا رہے اور لوگوں کی روزی روٹی بند نہ ہو۔''

''ٹھیک ہے اگر یہ بات ہے تو میں دو چار دنوں میں آپ کے کارخانے کا معائنہ کرنے کے لیے آؤں گا اور اس کے بعد ہی اپنا فیصلہ سناؤں گا۔''

''بھاسکر جی، میں آپ کی منتظر رہوں گی۔امید ہے مجھے نراش نہیں ہونا پڑے گا۔''

(۱۹)

ہفتہ بھر بعد بھاسکر بھاردواج چمڑا صنعت کے ایک ماہر، اپنی کمپنی کے مالیاتی صلاح کار اور رنبیر چوہان کے ہمراہ زبیدہ کے کارخانے پر پہنچے، سارے کارخانے کا معائنہ کیا، آپس میں صلاح مشورہ کیا اور پھر زبیدہ اختر سے مخاطب ہوئے۔

''زبیدہ جی، کارخانہ تو خستہ حالت میں ہے اور اس کی جدید کاری میں کافی سرمائے کی ضرورت ہے۔میری یہ تجویز ہے کہ آپ اس کارخانے کی زمین، عمارت اور ساز و سامان کو ایک نئی کمپنی کے نام ٹرانسفر کر لیجیے جو ہماری اصل کمپنی سویتا انٹرپرائزز کے تحت ذیلی کمپنی کے

طور پر کام کرے گی۔ آپ ذیلی کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرس کے ممبر بھی ہوں گے۔ اس کے ۲۵ رفیصد حصص آپ کو دیے جائیں گے اور باقی ۷۵ رفیصد حصص اصل کمپنی کے نام ہوں گے۔ آپ کو مزید اور کوئی سرمایہ کاری کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی اور نہ ہی روزمرہ کام کی نگرانی کرنی پڑے گی۔ سرمایہ کاری، نگرانی، پروڈکشن اور مارکیٹنگ کا کام ہم خود ہی سنبھالیں گے۔ جب کمپنی کا منافع ہوگا تو آپ کو اپنے حصص کے حساب سے اس میں سے ۲۵ رفیصد حصہ ملے گا۔ اس تجویز پر آپ غور کریں اور مجھے ایک دو روز میں اپنی رائے سے آگاہ کریں۔''

یہ کہہ کر بھاسکر اور اس کی ٹیم زبیدہ اختر سے اجازت لے کر روانہ ہوگئی اور زبیدہ کی رائے کا انتظار کرنے لگی۔

زبیدہ نے نہ صرف اپنے قریبی بھروسے مند لوگوں سے بلکہ سُچیتا سے بھی اس بارے میں بات کی، سب کی رائے یہی تھی کہ خسارے کے چلتے آپ کی ساری جائیداد چند برسوں میں ڈوب جائے گی اور آپ کے پاس کچھ بھی نہ رہے گا۔ بہتر یہ ہے کہ اس کو بھاسکر کے حوالے کر دو اور امید کرو کہ وہ کارخانے کو واپس منافع بخش بنائے گا اور اس کے بعد جب بھی کمپنی منافع کا اعلان کرتی ہے تو تمھیں بھی اس میں سے اپنا حصہ مل جائے گا۔ رہا حصے کی شرح کا سوال، تمھیں یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ چمڑے کی صنعت میں تکنالوجی کے لحاظ سے کافی بدلاؤ آچکا ہے، اس لیے کارخانے کی جدید کاری میں نہ صرف نئی مشینری چاہیے بلکہ روزمرہ اخراجات اور مزدوروں و دیگر اسٹاف کے لیے روزانہ اُجرت بھی چاہیے۔ شاید اس کام کے لیے بنک سے قرضہ بھی لینا پڑے گا جس کا سود بھی ادا کرنا پڑے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ وقت بہت آگے بڑھ گیا ہے اور کارخانہ متروک ہو چکا ہے، اس میں نئی روح ڈالنے کی ضرورت ہے۔ مختلف آرا سن کر زبیدہ نے بھی فیصلہ کر لیا کہ وہ بھاسکر بھاردواج کے پاس جا کر اس کی شرطوں پر اتفاق کی مہر ثبت کرے گی اور کارخانے میں کام کر رہے کاریگروں کا مستقبل سنوارنے کی کوشش کرے گی۔

دوسرے روز وہ بھاسکر کے دفتر میں حاضر ہوئی اور اپنی رضامندی سے اس کو آگاہ کر دیا۔ اس کے بعد باقی کاغذی کارروائی کرنے میں تقریباً ایک مہینہ لگ گیا۔

بھاسکر نے ایک لیدر ٹیکنالوجسٹ کی خدمات حاصل کر لی اور اسے کارخانے کو جدید طرز کے مطابق بنانے کی ہدایت دی۔ کارخانے میں نئی اور جدید مشینیں نصب کر لی گئیں۔ جوتوں کے تلووں کے لیے موڈرن ربر، پولی یورتھین اور فوم کا استعمال کیا جانے لگا۔ جوتوں کی سلائی کے لیے مشین کے بدلے ہاتھ کو ترجیح دی گئی اور کوالٹی کا خاص خیال رکھا گیا۔ ایک جانب پیداواری لاگت کم کی گئی اور دوسری جانب تیار مال کی پیکنگ نئے اور دلکش انداز میں کی گئی تاکہ گاہک دیکھ کر ہی متوجہ ہو جائیں۔ مارکیٹنگ کے لیے سویتا انٹرپرائزز کا سہارا لیا گیا۔ ہولے ہولے کمپنی ڈھرے پر آ گئی اور کچھ برسوں ہی میں منافع کمانے میں کامیاب ہو گئی۔ صنعتی تنوع کا یہ بھاسکر کا پہلا قدم تھا جس میں وہ کامیاب ہو گیا اور انجام کار اس کی خود اعتمادی میں کافی اضافہ ہو گیا۔ اُدھر زبیدہ اور سُچیتا کو بھی اس کی کارکردگی پر کافی فخر محسوس ہو رہا تھا۔

(۲۰)

زبیدہ اختر کے لیے اس کی کلاس فیلو سُچیتا راٹھور ایک رول ماڈل بن گئی تھی۔ وہ بھی اسی کے نقش قدم پر چلنا چاہتی تھی اور اپنے گاؤں و آس پاس کی بستیوں میں نئی روح پھونکنا چاہتی تھی۔ اس حوالے سے اس نے دو تین بار سُچیتا کے دفتر میں حاضری دی اور اس کے ساتھ بھوانی پور اور پاس پڑوس کے کئی گاؤں کا دورہ بھی کیا جہاں اس نے کاریگروں کو کام کرتے دیکھا، مختلف اقسام کی چیزیں بنانے کا عمل دیکھا اور ان کو سمجھنے کی کوشش کی۔ کاریگر عورتوں سے تعامل کے دوران اسے پتہ چلا کہ امداد باہمی سے بہت سارے سنگ میل طے کیے جا سکتے ہیں۔ ان عورتوں نے اس کے سامنے وہ حالات بیان کیے جن کے سبب کئی گاؤں قحط سے تباہ ہو چکے تھے اور لوگوں کو جینے کی کوئی امید باقی نہیں رہی تھی۔ اس وقت دیدی نے کیسے کمر کس لی، ان کے لیے کس طرح خود روزگار پیدا کرنے کے ذرائع تلاش کیے اور اس میں کس قدر سرخرو ہوئیں، ان سبھی واقعات کو یوں بیان کیا جیسے وہ منظر ان کی آنکھوں کے سامنے گزر رہے

ہیں۔علاوہ ازیں یہ بھی بتایا کہ دیدی نے نسوانی تعلیم اور تعلیم بالغان پر بھی زور دیا اور اپنی کچھ رفیق کاروں کی مدد سے یہاں کی خواتین کو نہ صرف پڑھایا لکھایا بلکہ موجودہ حالات سے ہمکنار ہونے کا ہنر بھی سکھلایا۔اس نے کئی صنعت کاروں سے مکر رمنت سماجت کر کے یہاں چھوٹی بڑی صنعتیں بھی لگوادیں۔آج ان گاؤں کی شکل وصورت ہی بدل چکی ہے۔سرکار نے بھی دیدی کے کام کو سراہا اور ہر طرح سے امداد کی۔وقت گزرنے کے ساتھ پانی، بجلی اور سڑک یہاں تک کہ ٹرین کا بھی بندوبست کیا۔آج جو کوئی بھی ان گاؤں کو دیکھتا ہے وہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہاں کبھی ویرانیوں نے ڈیرہ ڈال دیا تھا، ہر طرف موت منڈلا رہی تھی اور یہاں کے باشندے اپنی جان بچانے کے لیے شہروں اور قصبوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔اب تو ایسا وقت آیا ہے کہ دوسرے علاقوں سے لوگ یہاں روزگار ڈھونڈنے چلے آتے ہیں۔

زبیدہ یہ سن کر پھولی نہ سما رہی تھی۔اس کی ایک ہم جماعت نے معجزے سے کچھ کم نہیں کیا تھا۔اب وہ بھی چاہتی تھی کہ خود اپنے اور آس پاس کے گاؤں کی عورتوں میں بیداری کی جوت جگائے اور ان کو بھی اس قابل بنائے کہ وہ چار پیسے کما سکیں اور اپنے بال بچوں کو تعلیم دے سکیں۔

زبیدہ کا یہ عمدا اتنا آسان نہیں تھا جتنا کہ سُچیتا کا۔سچیتا نے جب قصد کر کے یہ قدم اٹھایا تھا اس وقت ماحول اس کے حق میں تھا۔لوگ پریشاں تھے،عورتیں بے حال تھیں اور بچے بلک رہے تھے۔ڈوبتے کو تنکے کا سہارا،سبھی نے اس کی بات مان لی۔مگر یہاں حالات کچھ مختلف تھے اور زبیدہ کو کئی طرف سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔کچھ مولوی اس کو مذہب کے خلاف سرکشی کہنے لگے۔سیاسی رہنما جن کے ووٹ ناخواندہ،غریب اور جاہل لوگوں پر منحصر ہوتے ہیں،وہ اس کو ایک کھلا چیلینج سمجھ رہے تھے جبکہ گاؤں کے سربراہ عورتوں کی آزادی کے تصور سے ہی تلملا رہے تھے۔مگر زبیدہ سر پر کفن باندھ کر نکلی تھی اور اپنی مہم کو کامیاب بنانے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھی۔چنانچہ اس نے پہلے ہی سے لڑکیوں کے لیے اسکول کھول رکھا تھا اور بہت ساری لڑکیاں تعلیم سے آراستہ ہو چکی تھیں،وہ بھی اس کی مدد کرنے کے لیے آگے

آ گئیں۔ زبیدہ اختر نے ان کی ایک فوج تیار کی اور وہ سب گھر گھر جا کر عورتوں سے ملتیں، ان کو نہ صرف تعلیم کے فوائد سے روشناس کرتیں بلکہ تندرستی، صفائی، زچگی، ہائجین، صحت بخش غذا اور بچوں کی پرورش کے بارے میں بتلاتیں۔ ان کی کوششوں میں کافی وقت لگا مگر دھیرے دھیرے نتیجے سامنے آنے لگے۔ عورتوں کی بیداری نے انھیں اپنی مرضی سے اس مہم کا حصہ بننے کی تحریک دی اور وہ خود روزگار مہم کے تحت گھریلو چیزیں جیسے پاپڑ، اچار، مصالحے وغیرہ اور کھادی و دستکاریاں بنانے میں منہمک ہوگئیں۔ ان اشیا کی بکری کے لیے زبیدہ نے سُچیتا کے بھوانی کواپریٹو کے ساتھ معاہدہ کیا اور اس طرح گاؤں کا مال 'بھوانی برانڈ' کے تحت فروخت ہونے لگا۔ انجام کار ان گاؤں میں بھی روزگار کے وسیلے بڑھ گئے اور لوگوں خاص کر گھریلو عورتوں کی آمدنی یقینی ہوگئی۔ کبھی کبھار سُچیتا بھی اس کے کارخانوں کا معائنہ کرتی اور کہیں کوئی کوتاہی نظر آتی تو اس کو دور کرنے کی ہدایت دیتی۔

معاملہ یہیں نہیں رُکا۔ زبیدہ نے ماحول کی کثافت کے بارے میں بھی گاؤں کی عورتوں کو آگاہ کیا اور ان کو جگہ جگہ تالاب کھود کر پانی کا تحفظ کرنے، شجرکاری اور زمین میں پانی کی سطح کو اوپر لانے کی تربیت دی۔ انجام کار یہ علاقہ بھی بتدریج ہرا بھرا ہونے لگا۔ دوسری جانب سرکار سے بھی کافی امداد ملنے لگی۔ پختہ سڑکیں، پینے کا پانی اور بجلی کی فراہمی کے لیے سرکار کمر بستہ ہوگئی۔ زبیدہ کا اسکول پرائمری سے ترقی پا کر ہائیر سیکنڈری اسکول بن گیا۔ سرکار نے بھی اس کے علاوہ ایک اور اسکول کھول دیا اور وہاں سے بہت سارے نوجوان تعلیم پا کر روزگار کی تلاش میں گاؤں سے باہر نکلنے لگے۔

(۲۱)

وِدوشی اور میترئی، سُچیتا راٹھور کی دو لے پالک بیٹیاں، اب اپنے نام کے ساتھ راٹھور لگاتی تھیں اور سُچیتا کو ہی اپنی ماں مانتی تھیں۔ وہ یہ بات بھول چکی تھیں کہ ان کے والدین نے

پیدا ہوتے ہی انھیں یتیم خانے میں ڈال دیا تھا۔ان کے حیاتیاتی والدین کون تھے کسی کو معلوم نہیں ۔زندگی کا وہ تاریک باب ماضی میں کہیں گم ہو چکا تھا اور اب وہ اپنے مستقبل کو سنوارنے میں رات دن محنت کر رہی تھیں ۔دونوں بہت ہی عقل مند ثابت ہوئیں اور عقل کے ساتھ اگر طالب علم محنت بھی کرے تو آسمانوں کی اُڑان بھرنے سے اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ان کے سامنے ان تھک محنت و مشقت کرنے والی مورت ان کی ماں سُچیتا تھی جو ان کی رول ماڈل بن چکی تھی۔

دو معصوم بچیوں کو گود لیتے سمئے جہاں سُچیتا راٹھور کو کمسن بے سہارا لڑکیوں پر ترس آ گیا تھا وہیں آگے چل کر اسے یتیم خانہ کھولنے کی تحریک بھی ملی تھی۔جب تک اس نے اپنے گاؤں میں یتیم خانے کی بنیاد نہیں ڈالی اس کی دونوں بیٹیاں اس کے ساتھ رہیں اور مقامی اسکولوں میں پڑھائی کرتی رہیں ۔سُچیتا کا مجرد مادریت (Single parenting) کا تجربہ بہت ہی کامیاب رہا۔اس نے ان دونوں بیٹیوں کے لیے وہ سب کچھ کیا جو ماں باپ مل کر بھی نہیں کر سکتے تھے۔ان کی ہر ضرورت پوری کی،ان کو پڑھایا لکھایا اور اپنی ٹانگوں پر کھڑا کیا۔

گاؤں لوٹنے سے پہلے ہی دونوں بیٹیوں کو شہر میں رہائشی پبلک اسکول میں داخلہ کرایا گیا۔وِدوشی کی دلچسپی قانون میں تھی سو اس نے گریجویشن مکمل کر کے ایل ایل بی کے لیے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف لا ، بنگلور میں داخلہ لیا۔امتحان میں اچھی پوزیشن لانے کے سبب اس نے وہیں سے ایل ایل ایم کی ڈگری بھی حاصل کر لی ۔کچھ مہینوں کے لیے ڈسٹرکٹ کورٹ میں تجربہ حاصل کیا اور پھر جودھپور ہائی کورٹ میں پریکٹس کرنے کے لیے ایک نامور وکیل کی شاگردی قبول کر لی۔اسے ہر بار اپنی ماں سُچیتا راٹھور کی بات یاد آتی کہ ''بیٹی زندگی میں کہیں فراغت نہیں ملتی،ایک مرحلہ ختم ہوتا ہے اور دوسرا سر پر آن کھڑا ہوتا ہے۔تم یہ نہ سوچنا کہ اسکول کی پڑھائی ختم ہو گئی تو اب آرام ہی آرام ہے۔اس کے بعد کالج ہے، پھر پیشہ ہے اور اس میں کامیاب ہونے کی للک ہے۔آگے آگے اور بھی کئی نئی چنوتیاں سامنے آتی رہیں گی۔محنت اور لگن ہی زندگی میں کامیاب ہونے کی کنجی ہے۔''اس بات کو وِدوشی نے گانٹھ باندھ کر رکھا تھا اور

ہر قدم پر اس کا پالن کرتی رہی ۔ ہائی کورٹ میں اس کی کارکردگی پر سبھی خوش ہوئے اور کچھ برس کے بعد آخر کار اس نے اپنی آزاد پریکٹس شروع کر دی۔

ماں کی دیکھا دیکھی میں خدمت خلق وِدوشی کی زندگی کا بھی نصب العین بن گیا۔ اس نے وکالت کی اپنی چھوٹی سی زندگی میں کئی سنگ میل طے کیے ۔ کئی متروکہ خواتین کو نان ونفقہ اور جائیداد میں سے حصہ دلوایا۔ بیوہ عورتوں کو مرحوم شوہر کی گریچوٹی و ماہانہ وظیفے اور جائیداد سے واجب حصہ دلوایا۔ جہیز کے باعث ٹھکرائی ہوئی عورتوں کو ان کا حق دلوایا اور گناہ گاروں کو سزا دلوائی ۔ یہاں تک کہ جن عورتوں کو زندہ جلایا گیا یا جلانے کی کوشش کی گئی ان کے سسرال والوں کو کیفر کردار تک پہنچا دیا۔ غریب نادار بچوں کی ، جو گھریلو چپقلش کا شکار ہو گئے تھے ، پرورش کا انتظام کرایا اور متعلقہ والدین سے ان کے لیے ماہوار خرچہ طے کرایا۔ غرضیکہ مظلوم عورتوں اور بچوں کی باز آباد کاری اس کی زندگی کا مقصد بن کر رہ گئی ۔ دیکھا جائے تو اس مختصر مدت میں اس نے سماج سیوا کے میدان میں خاصا یوگدان دیا اور اپنی ماں کی مجازی شبیہ بن کر رہ گئی۔

دوسری جانب میترئی نے بھی اپنے سفر میں کئی سنگ میل پار کیے ۔ اسکول کی پڑھائی ختم کی ، قومی سطح پر میڈیکل کالج میں داخلے کا امتحان کامیاب کیا جس کے سبب آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس ، نئی دہلی میں ایم بی بی ایس کا داخلہ مل گیا۔ ساڑھے پانچ سال محنت ومشقت کرتے گزر گئے ۔ اس دوران ماں سے کئی بار ٹیلی فون پر بات ہوتی رہتی تھی جبکہ موسم گرما کی چھٹیوں میں ملاقات بھی ہو جاتی ۔ ان دنوں چھٹیوں کے سبب وِدوشی بھی گھر پر ہی ہوتی اور تینوں مل بیٹھ کر گپیں ہانکتے ، اپنے تجربے ساجھا کرتے اور مستقبل کے منصوبوں پر ایک دوسرے کے ساتھ مذاکرہ کرتے ۔ یہ سمے تفریح کا بھی تھا اور سیکھنے کا بھی ۔ کئی پیچیدہ مسئلوں پر ایک دوسرے کی رائے جان کر راہ کو ہموار بھی کیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی تو سمت بھی بدلنی پڑتی تھی ۔ مگر وہ خندہ پیشانی کے ساتھ یہ سب کچھ کرتے اور آگے کی زندگی کے لیے تیار ہو جاتے ۔ چھٹیاں کیسے ختم ہو جاتیں پتہ ہی نہیں چلتا۔ میترئی راٹھور نئے ارادے لے کر واپس چلی جاتی اور اپنے کام میں لگ جاتی ۔ اس کو امراض نسواں اور زچگی (Gynaecology)

(Gynecology & Obstetrics) میں دلچسپی تھی، اس لیے ایم بی بی ایس مکمل کرتے ہی اس مخصوص شعبے میں ایم ڈی کرلیا۔ اس کے بعد میترئی نے اپنے گھر کے نزدیک شہر کے بڑے اسپتال میں پریکٹس کرنا شروع کردیا۔

دہلی میں میترئی راٹھور کو بڑے بڑے اسپتالوں سے کئی آفر مل گئے جن کے سبب اس کا کیرئر بلندیوں کو چھوسکتا تھا۔ وہ تازہ ترین تکنالوجی سے خود کو لیس کرسکتی تھی اور اس میدان میں کافی نام کما سکتی تھی۔ میترئی نے اس بات پر کئی بار غور کیا مگر دل نے ہر بار منع کردیا۔ اس کو اپنی ماں، سُچیتا راٹھور کی زندگی یاد آجاتی اور وہ اسی کے نقش قدم پر چلنا چاہتی تھی۔ بطور ڈاکٹر بھی وہ عام اور مظلوم عورتوں کی خدمت کرسکتی تھی۔ اسے بار بار یاد آتا کہ اگر سُچیتا ممی نہ ہوتی تو وہ نہ جانے کہاں دردر کی ٹھوکریں کھاتی پھر رہی ہوتی۔ غریب مظلوموں کے لیے بھگوان کوئی تو سہارا بھیج دیتا ہے، پھر کیوں نہ میں بھی ان ہی لوگوں کا سہارا بننے کی کوشش کروں۔ وہ جہاں امیر مریضوں سے، جو علاج کا خرچہ بخوبی اٹھا سکتے تھے، پورا فیس اور علاج معالجے کا خرچہ وصول کرتی تھی وہیں درمیانہ طبقے کے مریضوں سے خاص کر بے سہارا خواتین سے ان کی حیثیت کے مطابق فیس اور خرچہ طلب کرتی تھی تاکہ ان پر زیادہ بوجھ نہ پڑے۔ جہاں تک غریبوں اور مفلسوں کا سوال تھا وہ ان سے فیس لینا گناہ سمجھتی تھی اور بدترین معاملات میں اپنی جیب سے ان کی مالی اعانت کرتی تھی۔ بدلے میں مریض اس کو دعائیں دے کر اسپتال سے رخصت ہوجاتے۔

(۲۲)

سُچیتا راٹھور کو اس بات کا احساس تھا کہ وَردان اَناتھ آشرم میں پل رہے بچّوں کی حفاظت اور پرورش کرنا ہی کافی نہیں ہے، اس لیے اس نے وَردان پرائمری اسکول بھی کھولا اور بعد میں اس کو بہتر بنا کر سیکنڈری اسکول میں تبدیل کرلیا تاکہ آشرم میں پل بڑھ رہے بچّے

معیاری تعلیم سے آراستہ ہوں۔ بنیادی تعلیم حاصل کرنا ہر بچّے کے لیے ناگزیر تھا، اس سے بچ نکلنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اکثر بچوں نے تعلیم حاصل کرنے میں دلچسپی دکھائی اور اس میدان میں کافی ترقی کی۔ اسکول کی مالی حالت خراب نہ ہو جائے اس لیے آشرم کے بچوں کے علاوہ باہر سے بھی بچوں کو داخلہ دیا گیا اور ان سے باضابطہ فیس لی گئی۔ اسکول میں داخلہ لینے کے لیے طلبہ کی لائن لگ جاتی کیونکہ بورڈ میں اسکول کا رزلٹ ہر سال بہت ہی متاثر کن ہوتا، اس لیے والدین فیس دینے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے۔ یہ سب کرامات سُچیتا میڈم اور اسکول کے اسٹاف کی بدولت تھیں جو صبر و تحمل اور دل دہی سے بچوں کو پڑھاتے تھے۔

ظاہر ہے کہ ہر دور مہارت چاہتا ہے چاہے نیا فن ہو یا نیا ہنر، جب تک طالب علم اس میں کمالِ استعداد حاصل نہ کرے اس مسابقتی دور میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ نتیجتاً بچوں میں طالب علمی دور ہی سے پیشہ ورانہ صلاحیت حاصل کرنے کی قابلیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ طلبہ میں سے چند ایک بچّے ایسے بھی نکلے جو اپنی محنت و مشقت کی بدولت ڈاکٹر یا انجینئر بن گئے جبکہ دوسرے طلبہ کے لیے پیشہ ورانہ مہارت حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کی تربیت دلوائی گئی۔ کچھ طلبہ نے آئی ٹی آئی سے ڈپلومہ کی سند لی، کچھ طلبہ نے وکالت کی تربیت پائی اور کچھ نے سائنس یا آرٹس میں پوسٹ گریجویشن کیا۔ قصہ کوتاہ ہر طالب علم کو اس کی صلاحیت کے مطابق موقعہ فراہم کیا گیا۔

کچھ ایسے بھی طالب علم تھے جو پڑھنے لکھنے سے زیادہ پیشہ ورانہ اور تفریحی مشاغل کے شوقین تھے۔ ان کی صلاحیتوں کو مزید نکھارنے کے لیے کئی اقدامات کیے گئے مثلاً مصوری، گانے اور ناچنے کے لیے مقامی اساتذہ کی مدد لی گئی۔ جن میں ٹیلنٹ کی بھرمار پائی گئی انھیں آگے پیشہ ورانہ تربیت گاہوں میں بھیج دیا گیا۔ اسی طرح کھیلوں کے حوالے سے طلبہ کے لیے کچھ کھیلوں جیسے کرکٹ، ہاکی، بیڈمنٹن اور ٹیبل ٹینس کا انتظام کیا گیا اور انھیں مقامی کلبوں کے لیے کھیلنے کے مواقع فراہم کیے گئے۔ ان میں سے بھی چند ایک نے کمالِ ہنر کا مظاہرہ کیا اور آگے ہی آگے بڑھتے گئے یہاں تک کہ قومی سطح تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ممکن ہے کہ اتنا

سب کچھ وَردان آشرم کی حقیت دار سے تنہا نہ ہو پاتا مگر اس کی اَن تھک کوششوں نے یہاں بھی حیرت انگیز کام کیے۔ سُچیتا راٹھور نے اس بارے میں چند ایک صنعتی گھرانوں کے منتظمین سے رابطہ قائم کیا اور انھیں وَردان آشرم کی تاریخ اور مقصد سے آگاہ کر کے تجویز پیش کی کہ وہ ذہین اور باصلاحیت بچوں کو ان کے پسندیدہ تربیتی کورسز کے لیے مالی کفالت کرنے کی ضمانت دیں۔ کئی صنعت کاروں نے بچوں کو اعلیٰ تعلیم یا پیشہ ورانہ مہارت پانے کے لیے اسپانسر کرنے میں اپنی رضامندی ظاہر کی۔ اس طرح جو بھی طالب علم بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرتا اس کی آگے کی تربیت کا سارا خرچہ کوئی نہ کوئی صنعت کار اٹھاتا۔ اس تعاون کی وجہ سے سُچیتا کی فکر و سوچ انسان کے ہمدرد پہلو کے حوالے سے روز بروز تقویت پاتی گئی اور اسے پورا یقین ہو گیا کہ انسان ایسے ثمر آور درخت کی مانند ہے جو کل ذی روح کے لیے اپنا پھل ہمیشہ بانٹنے کے لیے تیار رہتا ہے۔

کوشکی نے شروع ہی سے پڑھائی لکھائی سے زیادہ کھیل کود میں دلچسپی دکھائی۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ کرکٹ کھیلا کرتی اور ہر وقت اس کی کارکردگی عمدہ رہتی۔ مقامی ٹیموں کے ساتھ میچ بھی ہوتے جن میں کوشکی کا مظاہرہ بہترین رہتا۔ ریاستی کرکٹ ٹیم کی ٹرائلز کے دوران کوچ نے، جو مقامی میچوں میں ٹیلنٹ چن رہا تھا، سُچیتا راٹھور کو مشورہ دیا کہ اس لڑکی میں ایسی قابلیت ہے جس کے بارے میں ہم سوچ بھی نہیں سکتے مگر اس کو سنجیدگی سے تربیت کی ضرورت ہے اور وہ یہاں نہیں بلکہ بڑے شہروں ہی میں دستیاب ہے۔ سُچیتا کو پریشانی ہوئی کہ یہ کیسے ممکن ہو سکے گا مگر اس کے ذہن میں دفعتاً کوندا سا لپکا۔ اس کو رنبیر چوہان کی یاد آ گئی۔ رنبیر چوہان نے کئی برس پہلے آشرم آنا بند کر دیا تھا مگر رابطے کے لیے اپنا ایڈریس اور لینڈ لائن نمبر دے کر گیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ہر رکشا بندھن کے تیوہار پر آشرم میں حاضری دیتا اور سُچیتا راٹھور سے اپنی دائیں کلائی پر راکھی بندھواتا۔ سُچیتا راٹھور اس کو دیکھ کر بہت خوش ہو جاتی اور اسے لگتا کہ رنبیر کے ساتھ اس کا خون کا رشتہ ہے۔ حقیقت میں یہ رشتہ ہی ایسا ہے کہ ہر بہن کو اس پر بہت ہی فخر محسوس ہوتا ہے۔ اس رشتے کے سبب سُچیتا جذبات میں بہہ جاتی اور رنبیر سے

یہ پوچھنا ہی بھول جاتی کہ تم کون ہو اور تمھیں آشرم آنے کی تحریک کیسے مل گئی؟ کیا تم یہ خود سے کرتے ہو یا تمھارے پیچھے کوئی اور ہے جو تم سے یہ کام کراتا ہے؟

بھائی بہن کا یہ رشتہ صرف ہندوستانی کلچر کا ایک اہم حصہ بن کر رہ گیا ہے۔تاریخ میں درج ہے کہ اس دھاگے نے اسکندر جیسے عالمگیر کی جان بچائی تھی۔ یہ دھاگہ ایک بہن کو بھروسہ دلاتا ہے کہ اس کی حفاظت کے لیے اس کا بھائی جان بھی دے سکتا ہے۔ ملک کی سرحدوں پر تعینات لاتعداد سپاہی اس مقدس دھاگے کے اثر سے اپنی کلفتیں بھول جاتے ہیں اور ملک کی حفاظت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ وہ چاہے انیس ہزار فٹ اونچے سیاچن گلیشر پر تعینات ہوں یا پھر راجستھان کا تپتے تھر ریگ زار میں کھڑے ہوں، ہمارے نڈر سپاہی اس ایک دن کا بےصبری سے انتظار کرتے ہیں جب ان کے گھر سے ان کی بہنیں راکھی بھیجتی ہیں یا پھر مقامی خواتین ان کو راکھی باندھتی ہیں۔ان جذبات کی الگ ہی کیفیت ہوتی ہے، الگ ہی رنگ ہوتا ہے۔ سارا دیش رکشا بندھن کے تیوہار پر جھوم اٹھتا ہے۔

تین برس کے بعد جب رنبیر چوہان راکھی بندھوانے کے لیے سُچیتا کے دفتر میں حاضر ہوا تو اس بار نہ جانے کیوں اور کیسے جذبات کی رو میں بہہ گیا۔ وہ سُچیتا سے یوں مخاطب ہو گیا۔

''دیدی، بہت مدّت سے میں سوچ رہا تھا کہ آپ کو ایک راز کی بات بتا دوں مگر ہمت نہیں ہو رہی تھی۔''

''ایسا بھی کیا راز ہے کہ تم بتا نہیں پا رہے ہو؟''

''کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ نہ نگلتے بنتی ہے اور نہ اگلتے بنتی ہے۔بس یوں ہی سمجھ لو۔''

''اگر ایسا ہے تو میں کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ بتاؤ گے تو شاید میں کچھ مدد کر سکوں۔''

''ہاں دیدی میں نے اس بار ٹھان لی ہے کہ میں آپ کو اس راز سے واقف کر دوں گا چاہے مجھے اپنی نوکری سے ہاتھ ہی دھونا پڑے۔'' اس نے کچھ وقفے کے لیے خاموشی اختیار کی اور پھر گویا ہوا۔ ''دیدی، دراصل آپ کا ایک مداح ہے جو آپ کی بہت عزت و احترام کرتا

ہے۔میں اس کی کمپنی میں ملازم ہوں۔ جب بھوانی گاؤں میں زلزلہ آیا تو وہ بہت پریشان ہو گیا، خود ہی اس علاقے کا جائزہ لینے کے لیے آیا اور جب اسے معلوم ہوا کہ آپ اور آپ کا وردان آشرم محفوظ ہے تو راحت کی سانس لے کر لوٹا۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ متاثرہ لوگوں کی باز آباد کاری میں جُٹ گئی ہیں اور یہاں گھریلو صنعتوں کو عام کرنے کی کوشش کر رہی ہے تو اس نے مجھے آپ سے ملنے کو کہا۔ ساتھ ہی یہ بھی ہدایت دی کہ اپنی شناخت اور اس سے تعلق ظاہر نہ کروں۔"

سُچیتا راٹھور کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ رنبیر کے بھولے پن پر ترس کھانے لگی۔ بولی۔

"رنبیر، اچھا تو اس لیے جناب ہمارے یہاں تشریف لے آئے اور میری اتنی مدد کرتے رہے۔ لگتا ہے جس ٹرسٹ سے ہمارے یتیم خانے کو ہر مہینے روپے بطور عطیہ ملتے ہیں وہ ٹرسٹ بھی اُسی مہاشیہ کا ہے۔ شاید آج اس کی گتھی بھی سلجھ گئی۔" سُچیتا نے قہقہہ لگایا۔

"ہاں دیدی، وہ ٹرسٹ اس نے اپنی ماں کے نام سے بنایا ہے۔ اور اس میں ہر مہینے وہ اپنی ماہانہ آمدنی سے دس ہزار روپے جمع کراتا ہے۔ حالانکہ اس نے بہت ہی ادنیٰ سطح سے زندگی کا سفر شروع کیا ہے مگر آج اس کی کمپنی کروڑوں کا کاروبار کرتی ہے۔ کپڑوں اور دستکاریوں کی برآمد کرتی ہے۔ پھر بھی وہ اپنی زمین سے جڑا ہوا ہے۔"

سُچیتا راٹھور نے پھر ایک بار زور سے قہقہہ مارا اور کہا۔ "بھائی، نام تو بتا دو۔ اتنی بھی راز داری کی کیا بات ہے؟" حالانکہ اس نے نام کا اندازہ لگایا تھا تاہم سوچا کہ کیوں نہ مخرج ہی سے اس کی تصدیق کرائی جائے۔"

"دیدی، وہ تو آپ کو بہت ہی اچھی طرح سے جانتا ہے۔ آپ کی دل سے عزت کرتا ہے پھر بھی آپ اس کا نام پوچھ رہی ہیں۔ کیا آپ اس کو نہیں جانتی؟ کچھ تو اندازہ لگاؤ۔"

"نہیں رنبیر، میرا تو ذہن کام ہی نہیں کرتا ہے۔ تم کو ہی بتانا پڑے گا۔"

"دیدی، اس کا نام ہے بھاسکر بھاردواج۔"

بھاسکر کا نام لینا ہی کافی تھا جیسے سُچیتا کے کانوں میں رنبیر نے رس گھول دیا ہو۔ آج اتنے برسوں بعد اس نے کسی کے منہ سے بھاسکر کا نام سن لیا تھا۔ آہستہ آہستہ سُچیتا نے رنبیر سے اس کے بارے میں بہت ساری جانکاری حاصل کر لی۔ اسے اطمینان ہوا کہ کوئی تو اس دنیا میں ہے جو اس کو چاہتا ہے اور جس نے اس کی وجہ سے شادی نہیں کی۔ وہ دل میں سوچنے لگی کہ کاش ایک بار وہ سامنے آتا اور اس کے درشن ہو جاتے مگر ایسا قیاس کرنا بھی ممکن نہ تھا۔

(۲۳)

کوشکی کے کیرئر سے متعلق سُچیتا کو پورا یقین تھا کہ رنبیر ہی اس لڑکی کی مدد کر سکتا ہے اور اس کے لیے کسی اچھے شہر میں کوچنگ اور رہنے کا انتظام کرا سکتا ہے۔ اس نے رنبیر کے ساتھ اس کے دیے ہوئے ایڈریس پر رابطہ کیا اور اپنے دفتر میں بلایا۔ پھر اس کو کوشکی کی پرابلم سے واقف کرایا۔ پہلے تو رنبیر بہت گھبرایا کہ نہ جانے کیا بات ہوئی کہ فوراً بلاوا آ گیا۔ اسے خیال آیا کہ کہیں راز فاش ہو جانے سے کوئی نئی مصیبت تو نہیں آئی؟ پھر ماجرا سن کر اس نے لمبا سانس کھینچا اور اطمینان سے کہنے لگا۔

"میڈم، آپ بے فکر رہیں۔ یہ کوئی بہت بڑا کام نہیں ہے جو ہو نہ سکے۔ میں چند ہی دنوں میں آپ کو اس بارے میں پوری جانکاری دوں گا۔"

رنبیر چوہان نے بھاسکر بھاردواج کے اثر ورسوخ سے ممبئی کے ایک جانے مانے کرکٹ کوچ سے رابطہ کیا اور کوشکی کی تربیت کا انتظام کرایا۔ رہنے کا انتظام بھی وہیں پرائیوٹ ڈبلیو سی اے ہوسٹل میں کرایا۔ اور پھر کوشکی کو ساتھ لے کر ممبئی چلا گیا جہاں کوچ سے ذاتی طور پر اس کی نگرانی کرنے کی استدعا کی۔ واپسی پر اس نے سُچیتا راٹھور کو بتایا کہ اس کے رہنے کا خرچہ بھاسکر بھاردواج نے اپنے ذمے لے لیا ہے، اس لیے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

کوشکی کی تربیت دو ڈھائی برس تک چلتی رہی۔ اس درمیان اس نے ڈسٹرکٹ اور

ریاستی سطح کے میچ کھیلے اور ان میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ وہ آل راونڈر تھی، بلّے بازی اور گیند بازی ہر دو میں اپنا کمال دکھاتی۔ اس کے بلّے سے نکلے شاٹ ہندوستانی کرکٹ ٹیم کے سابقہ او پنر وریندر سہواگ کی یاد دلاتے تھے۔ جب وہ چوکا یا چھکّا مارتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ اس کے اندر چھپا ہوا مصیبتوں کا ابلتا لاوا باہر آنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ گیند کو انتہائی تنفر کے ساتھ اپنے بلّے سے مارتی تھی۔ آخر کار کوشکی کی محنت اور ثابت قدمی رنگ لائی اور تیسرے سال اس کا انتخاب قومی ویمنز کرکٹ ٹیم میں ہوا۔ یہی وہ دن تھا جس کا وہ بچپن سے انتظار کرتی تھی۔ اس کی کامیابی کے بارے میں سن کر سُچیتا راٹھور اور رنبیر چوہان دونوں خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ دوسری جانب بھاسکر بھاردواج کی خوشی کا بھی کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔

اگلے سال ہندوستان اور آسٹریلیا کی خواتین ٹیسٹ سیریز کھیلی گئی۔ تین میچوں کا سلسلہ تھا اور اس کے بعد پانچ ایک روزہ میچ تھے۔ ہندوستانی خواتین کرکٹ ٹیم کی طرف سے کوشکی نے ٹیسٹوں اور ایک روزہ میچوں میں سب سے زیادہ دوڑیں بٹور لیں۔ ٹیسٹوں میں اس نے لگاتار دو سینچریاں بنالیں۔ سبھی حیران رہ گئے۔ ذرائع ابلاغ نے اس کے ان کرتبوں کو خوب اچھالا۔ جگہ جگہ اس کے انٹرویو چھپتے رہے اور وہ پھولی نہ سما رہی تھی۔ اس کی دلی آرزو تھی کہ اس وقت سُچیتا میڈم اس کے ساتھ کھڑی ہوتی۔

ایک قومی اخبار میں انٹرویو کے دوران کوشکی نے اپنی زندگی کا پورا سفر بیان کیا۔

''میں ایک یتیم لڑکی ہوں جس کی ماں بہت سال پہلے پرہلادپور کے بھیانک زلزلے میں زخمی ہوگئی تھی اور لوگوں نے اسے نزدیکی اسپتال میں داخل کر دیا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ گئی تھی مگر وہاں پر ڈاکٹر اس کو بچا نہ سکے۔ چونکہ ہمارا اس دنیا میں اور کوئی نہ تھا اس لیے رضاکاروں نے اس کا داہ سنسکار خود ہی کر لیا۔ میں بے سہارا وہیں اسپتال کی سیڑھیوں پر روتی بسورتی رہی۔ وہیں پر مجھے بھگوان کی بھیجی ہوئی ایک خاتون فرشتہ مانسی موسی ملی جس نے مجھے گود میں اٹھایا اور اپنے ساتھ لے گئی۔ اس نے مجھے ایک یتیم خانے میں داخل کر دیا جس کو میڈم سُچیتا راٹھور چلاتی ہیں۔ وہ بھی فرشتے کا ہی دوسرا روپ ہے۔

جہاں تک دھندلی سی یادیں میرا ساتھ دے رہی ہیں، میری ماں کا نام رجنی ورما تھا اور وہ میرے ظالم پتا جی کے ہاتھوں گھریلو تشدّد کا شکار ہوئی تھی۔ بعد میں پتا جی اس کو چھوڑ کر کہیں غائب ہو گئے اور پتہ ہی نہ چلا کہ کہاں چلے گئے۔آج تک ان کی کوئی خبر نہیں ملی۔ زندہ ہیں یا مر گئے، کوئی کہہ نہیں سکتا۔ میری پرورش سُچیتا میڈم نے ہی کی جو میرے لیے ماں کے سمان ہے۔ میں آج جو کچھ بھی ہوں اسی کی وجہ سے ہوں۔ کرکٹ میں میری تربیت ممبئی میں ہوئی اور اس کا انتظام بھی میڈم سُچیتا ہی نے کرایا۔ وہاں میرے کوچ نے مجھے اپنی بیٹی کی طرح پالا اور بڑے خلوص کے ساتھ میری رہنمائی کی۔''

انٹرویو کا شائع ہونا تھا کہ ہر طرف کھلبلی مچ گئی۔ کئی کھوجی صحافی کوشکی کی زندگی کے بارے میں تفصیلات معلوم کرنے میں انہماک کے ساتھ جُٹ گئے۔ دھیرے دھیرے مختلف دھاگوں کو جمع کر کے اصلیت سے پردہ فاش ہو گیا۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ کوشل ورما، کوشکی کا حیات باپ، مالی طور پر بحال ہو کر پرہلاد پور واپس آ چکا تھا جہاں وہ اپنی املاک کی بازیابی میں منہمک تھا۔ اس کی سرگرمیاں تیز سے تیز تر ہو گئیں تھیں۔ البتہ شراب اور جوئے کی لت کو ترک کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

شراب، کباب اور جوئے کی دوستی مہنگی ضرور پڑتی ہے مگر اس کے کئی ضمنی فائدے بھی ہوتے ہیں۔ اچھے کلبوں میں شراب پی لو اور جوا کھیلو، لوگ آپ کو شہر کے رئیسوں میں گردانتے ہیں۔ نیٹ ورک بنانے میں اس سے بہترین اور کوئی ذریعہ دستیاب نہیں ہے۔ بڑے بڑے بزنس مین اور سیاست دان آپ سے دوستی کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ممبئی سے لوٹنے کے بعد کوشل ورما کے رویے میں کافی تبدیلی، پختہ کاری اور ٹھہراو آ چکا تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح خود کو ذلیل کرنے کے لیے بے تحاشہ شراب پیتا تھا نہ جوا کھیلتا تھا۔ اس نے رفتہ رفتہ ابھرتی ہوئی ایک سیاسی پارٹی، جن کلیان پارٹی، کے رہنماؤں کو شیشے میں اتار لیا اور اپنے لیے ایک خاص مقام بنا لیا۔ جن کلیان پارٹی نئی نئی میدان میں اتری تھی اور دیش میں انقلاب لانے کی باتیں کرتی تھی۔ وہ ایسا نظام بنانے کا وعدہ کر رہی تھی جس میں صرف محنت، دیانتداری اور

مساوات کا بول بالا ہوگا۔ مرکزی سطح پر اس پارٹی کے رہنما کوشل ورما کی مہمان نوازی سے بہت خوش ہوئے اور اس کو نمایاں طور پر آگے لانے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ یوں بھی پرہلاد پور میں بھونچال سے سب کچھ تلپٹ ہو چکا تھا۔ پرانے لوگ، پرانا کلچر اور پرانی یادگاریں سب مٹی میں دفن ہو چکی تھیں۔ سرکار نے متاثرہ لوگوں کی باز آباد کاری کے لیے از سرِ نو گاؤں بسانے کی کوشش کی تھی، کچھ خلق دوست پرائیویٹ کمپنیوں نے مالی امداد دی تھی اور رضا کار تنظیموں نے بھی اس تعمیرِ نو میں شرکت کی تھی۔ چند برسوں کے بعد ایسا محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ یہ وہی علاقہ ہے جو کبھی اجڑ گیا تھا۔ کوشل ورما کے لیے یہ خداداد موقع فراہم ہوا تھا جو اس کو زندگی کا نیا باب شروع کرنے کے لیے سازگار تھا اور مناسب بھی۔ اس نے اپنا سیاسی اثر و رسوخ استعمال کر کے بغیر وقت گنوائے بنکوں سے قرضہ لے کر اپنی موروثی زمین پر ایک عالیشان ہوٹل کھڑا کر لیا اور اس کی تکمیل و ترقی میں منہمک ہوگیا۔ دریں اثنا جن کلیان پارٹی نے اس کی خدمات طلب کر لیں اور آئندہ آنے والے الیکشن میں بطور امیدوار کھڑا کر لیا۔

اِدھر اس کی امیدواری کا اعلان ہوا اور اُدھر مخالف سیاسی پارٹی حد سے زیادہ سرگرم ہوگئی۔ پیپلز ڈیموکریٹک وسیکولر پارٹی کے رہنماؤں نے ایک فعال کھوجی صحافی کے ساتھ، جس کے بارے میں سنا تھا کہ وہ کوشکی کے انٹرویو کے بعد کوشل ورما کے بارے میں بہت کچھ کھنگال کر لایا ہے، رابطہ قائم کیا، اس کو مال وزر کا لالچ دیا اور کوشل ورما کے خلاف وہ سارے معلومات شائع کرنے کو اُکسایا جن کی دریافت اس نے بڑی محنت و لگن سے کی تھی۔ ان معلومات میں جو نمایاں چیزیں تھیں وہ یہ تھیں: جہیز کی مانگ کر کے برات واپس لوٹانا، ایک دولت مند لڑکی سے شادی کرنا اور اس کا مال لوٹ کر اس کو بے یار و مددگار چھوڑ دینا، شراب کے نشے میں گھریلو تشدد کا مرتکب ہونا، بیوی کا کئی بار خودکشی کرنے کی کوشش کرنا اور پڑوسیوں کا بیچ بچاؤ کرنا، بیوی اور ایک معصوم بیٹی کو چھوڑ کر ممبئی بھاگ جانا اور پھر کبھی اپنی صورت نہ دکھانا اور نہ ہی اپنے بال بچوں کی دیکھ بھال کرنا، ممبئی میں ایک امیر بیوہ کے ساتھ لِو اِن بندوبست کے تحت رہنا، بھونچال کے وقت اپنی اصلی فیملی کو نظر انداز کرنا، قومی اخباروں میں کوشکی کے بارے

میں پولیس کے شائع کردہ اشتہارات کو ریسپانڈ نہ کرنا اور پھر بہت عرصے بعد کروٹ بدل کر واپس اپنی جائے پیدائش میں آکر دوبارہ خود کو بطور ایک ہوٹل مالک کے پیش کرنا وغیرہ۔

اخبار میں کوشل ورما کے خلاف جو مسلسل رپورٹس شائع ہو رہی تھیں ان سے سارے علاقے کیا ساری ریاست میں ہلچل مچ گئی۔ ہر طرف اس کے کردار کے بارے میں چہ مہ گوئیاں ہونے لگیں۔ پہلے تو جن کلیان پارٹی نے بہت زور لگایا کہ متعلقہ صحافی کو خرید کر خاموش کر دیا جائے اور ان باتوں کی تردید کرائی جائے جو اس نے تحریر کی تھیں، پھر یہ کوشش کی گئی کہ کسی دوسرے تیز دھار والے صحافی کے قلم سے اس کے خلاف زہر اگلوایا جائے تاکہ وہ ناامید ہو کر یہ سب ترک کرنے پر مجبور ہو جائے۔ حد تو یہ ہوئی کہ صحافی کو اغوا کرنے کی اسکیم پر بھی غور کیا گیا اور اس کو جان سے مارنے کی دھمکیاں بھی دی گئیں مگر ان کی ہر کوشش ناکام رہی۔ کوشل ورما اور اس کی جن کلیان پارٹی کو جو نقصان ہونا تھا وہ ہو کر رہ گیا۔ آخر کار پارٹی نے کوشل ورما کو پارٹی کی بنیادی رکنیت سے برخواست کر دیا۔

یہ ساری خبریں موسی کی وساطت سے سُچیتا راٹھور کو ملتی رہتی تھیں۔

اُدھر کوشِکی نیشنل ٹیم کی ممبر بن چکی تھی اور ممبئی میں ایک کمرے کے فلیٹ میں رہائش پذیر تھی، اس لیے تازہ خبروں سے بے خبر رہتی۔ البتہ کبھی کبھار ٹیلیفون پر سُچیتا راٹھور سے جو بات چیت ہو جاتی تو صورت حال کے بارے میں تھوڑی بہت جانکاری مل جاتی۔

الیکشن کے کچھ روز پہلے پارٹی نے اپنا امیدوار بدل دیا اور کسی اور شخص کو پارٹی کی ٹکٹ دی۔ کوشل ورما کے لیے یہ بہت ہی زور کا جھٹکا تھا جس سے ابھر پانا مشکل ہو گیا۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم، نہ اِدھر کا رہا نہ اُدھر کا رہا۔ ایک تو اس نے الیکشن مہم کے لیے اپنی تجوری سے کافی دولت خرچ کی تھی لیکن پارٹی نے ابھی تک اس کو پارٹی فنڈ سے ایک دھیلا بھی نہیں دیا تھا، دوسرے ہوٹل کے کام کو فراموش کرنے کے سبب وہاں کی حالت بگڑ گئی تھی اور نہ صرف خسارہ ہونے لگا تھا بلکہ بنکوں کا قرضہ بڑھ گیا تھا۔ وہ تقاضے پر تقاضہ کر رہے تھے یہاں تک کہ قرقی کرنے کی دھمکی بھی دے رہے تھے۔ اس صدمے کی تاب نہ لا کر کوشل ورما نے دوبارہ بے

تحاشہ شراب پینا شروع کردی۔ عمر بھی اب کافی بڑھ چکی تھی اور اعضا میں اعتدال نہیں رہا تھا، اس لیے بدن میں رعشہ شروع ہو گیا تھا اور یادداشت میں بھی فرق آنے لگا تھا۔ فشارِ خون بھی کافی بڑھ گیا تھا جس کا بالراست اثر اس کے قلب پر پڑنے لگا تھا۔ دائیں بائیں کوئی مددگار نظر نہیں آ رہا تھا۔ ماضی میں کچھ عورتوں سے آنکھ مٹکا کیا کرتا تھا مگر وہ ممبئی میں رہ گئی تھیں، پرہلاد پور میں آنسو پوچھنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ اکیلا پن اس کو زہریلے ناگ کی مانند ہر پل ڈس رہا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد کوشل ورما نے شام کے ٹائم اپنے ٹیلی ویژن کا سوئچ آن کیا۔ غم غلط کرنے کے لیے وہ شراب پینے میں مصروف تھا، پھر سوچا کہ ٹیلی ویژن دیکھنے سے غم کے بارے میں سوچنے سے تھوڑی دیر نجات مل جائے گی۔ اتفاق سے اس وقت ہندوستانی خواتین کرکٹ ٹیم کا انگلینڈ کی خواتین کرکٹ ٹیم کے ساتھ ایک روزہ فائنل مقابلہ ٹیلی ویژن پر نشر ہو رہا تھا۔ انگلینڈ کی ٹیم نے پہلے بلّے بازی کی تھی اور اب ہندوستانی ٹیم کی باری تھی۔ کوشکی بطور اوپنر اپنی دوسری پارٹنر رُوچکا کے ساتھ بلا گھماتے ہوئے میدان میں اُتر گئی۔ اس کے چہرے سے متانت اور خود اعتمادی جھلک رہی تھی۔ کوشکی اور رُوچکا کے اترنے کی دیر تھی کہ میدان تالیوں سے گونج اٹھا۔ پہلے ہی اوور میں کوشکی نے ایک چھکّا اور تین چوکے جڑ دیے۔ انگلینڈ کی بالر کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کہاں گیند ڈالے۔ اس کی کپتان تذبذب میں پڑ گئی کہ اگر معاملہ ایسے ہی چلتا رہا تو دوڑوں کی باڑھ آ جائے گی۔ چونکہ پہلے دس اووروں میں دو سے زیادہ فیلڈرس کو تیس گز کی لائن سے باہر تعینات کرنے پر پابندی ہوتی ہے اس لیے کوشکی نے اس کا فائدہ اٹھایا اور دنادن چوکوں اور چھکّوں کی برسات کر دی جبکہ رُوچکا دوسرے سرے پر تماشہ دیکھتی رہی۔ بیچ میں جب کبھی اس کی باری آتی تو وہ سمجھداری سے کھیلتی اور ایک رن بنا کر پھر کوشکی کو ہی سامنے کر دیتی کیوں کہ وہ فارم میں تھی۔

کوشکی کے بلّے کی ایک ایک چوٹ کوشل ورما کے دل پر سنگین ضرب سے کم نہ تھی۔ اس نے دارو کی بوتل کھول رکھی تھی اور اس میں سے ایک ایک گھونٹ پیے جا رہا تھا۔ شراب کی وجہ سے اس کے حلق میں شدید جلن کا احساس ہو رہا تھا مگر وہ اس کو نظر انداز کرنے پر مجبور تھا۔ اس

نے کہیں سنا تھا کہ بی سی سی آئی نے خواتین کرکٹ ٹیم کو بھی مالا مال کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے اور خواتین کرکٹ کھلاڑیوں کو اب مرد کھلاڑیوں کی طرح ہی معاوضہ دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اب کوشکی ٹیلی ویژن، ریڈیو اور اخباروں کے اشتہاروں پر چھا گئی تھی اور ان ذرائع سے بھی اس کی کمائی میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کی دولت کا اندازہ لگا کر کوشل ورما حسد سے مچھلی کی طرح تڑپنے لگا اور اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ مگر تیر تو کمان سے نکل چکا تھا اس کا ترکش میں واپس آنا ناممکن تھا۔

(۲۴)

جب سے کوشل ورما نے ٹیلی ویژن پر اپنی بیٹی کوشکی کے درشن کیے تھے وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ چونکہ وہ بہت عرصہ پہلے پرہلاد پور میں بال بچوں کو چھوڑ کر ممبئی میں قیام کر چکا تھا اس لیے اس کو ممبئی کا وہ سمندر، وہ سڑکیں، وہ پُل، وہ گلیاں، وہ جھگی جھونپڑیاں اور وہ آسمان کو چھوتی ہوئی عمارتیں سب یاد آ رہی تھیں۔ اس کو معلوم ہوا تھا کہ کرکٹ کی وجہ سے کوشکی نے ممبئی کو ہی اپنا مسکن بنایا ہے۔ چھوٹا سا ایک کمرے کا سیٹ خرید لیا ہے اور اکیلی ہی وہاں رہ رہی ہے۔ اپنے والد سے کوشل ورما نے جو کچھ بھی ورثے میں پایا تھا یا جتنا بھی جہیز بیوی لے کر آئی تھی یا پھر جو کچھ بھی خود کمایا تھا وہ یا تو شراب کی نذر ہوا تھا یا پھر جوئے کی۔ دوستی کا دائرہ بہت بڑا تھا اور ان کے سامنے دھونس بھی جمانا پڑتی تھی اس لیے کبھی بخیلی سے کام نہیں لیا۔ پھر ممبئی میں لِوان شریک کے علاوہ اس کی کئی معشوقائیں بن گئی تھیں جن سے وہ عشق بازی کرتا تھا۔ ان کی نظر دل سے زیادہ اس کی جیب پر ہوتی تھی۔ ممبئی سے پرہلاد پور لوٹنے کے بعد نہ جانے وہ کہاں بھیڑ میں گم ہو گئیں البتہ ان میں سے صرف ایک ایسی تھی جو کوشل ورما سے مسلسل رابطہ بنائے ہوئے تھی۔ اسے نہ جانے کیوں ایسا لگ رہا تھا کہ یہ آدمی آگے جا کر کچھ نہ کچھ بڑا کرنے والا ہے اور پھر اس کی پانچوں انگلیاں گھی میں ہوں گی۔

ممبئی میں تو وہ کوئی کمال نہیں کر پایا اس لیے واپس پر ہلاد پور کا رخ کر لیا۔ وہاں اس کی بچی کھچی جائیداد تھی۔ باپ زمیندار ہوا کرتا تھا اور اس کے اوپر ساہوکار بھی۔ جائیداد کافی چھوڑ کر گیا تھا، کچھ بِک گئی تھی اور کچھ ابھی بھی بچی ہوئی تھی۔ باپ کے ہوتے ہوئے گھر میں اچھی رونق ہوا کرتی تھی۔ مگر اس کے جانے کے بعد نہ جانے کس کی آہ اس گھر کو لگ گئی۔ کوشل ورما پڑھائی کے معاملے میں نکما نکلا، یار دوست ایسے چن لیے جن کو دیکھ کر ہی گھن آتی تھی، شراب نوشی اور جوا کھیلنے کا عادی بن گیا اور کبھی کبھار نشہ بھی کرتا تھا۔ روز گھر آ کر بیوی سے کھٹ پٹ ہو جاتی اور بات مار پیٹ تک پہنچ جاتی تھی۔ کوشکی تو بہت چھوٹی تھی، قریباً چار سال کی، جب باپ نے اس کو اور اس کی ماں کو چھوڑ دیا تھا اور ممبئی بھاگ گیا تھا۔ ہر روز ماں کی دُردشا دیکھ کر وہ کڑھتی اور روتی رہتی۔ یہ یادیں کوشکی کے ذہن پر اب بھی نقش ہیں۔

کوشل ورما نے پر ہلاد پور واپس آ کر اپنی زندگی کی ایک نئی شروعات کرنے کی سعی کر لی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ نشے، شراب اور جوئے سے پرہیز کرنے کی کوشش کرے گا اور باپ دادا کی جائیداد کو سمیٹ کر کوئی نیا کام شروع کرے گا۔ اس نے جائیداد کا بیشتر حصہ بیچ کر باقی ماندہ پلاٹ پر ایک اچھا خاصہ تین منزلہ ہوٹل کھڑا کر دیا جس کے لیے اس نے اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کر کے بنک سے قرضہ بھی لیا۔ ہوٹل خوب چلا۔ اس کو کھویا ہوا اعتماد واپس آیا۔ انھی دنوں ایک نئی سیاسی پارٹی نے لوگوں کو نئے خواب دکھانا شروع کر دیا جس کے سبب کوشل ورما نے بھی اپنی قسمت اس پارٹی کے ساتھ جوڑ دی۔ پانسہ تو خوب پڑا تھا یہاں تک کہ آنے والے الیکشن میں اس کی امیدواری پکی ہو گئی مگر شومئی قسمت انھی دنوں کوشکی کا انٹرویو شائع ہوا جس کا سایہ کوشل ورما پر پڑ گیا اور اس کے ماضی کی چھان بین ہونے لگی۔ اس کی بدکرداری، عورت ذات سے غفلت، گالی گلوچ و مار پیٹ اور سب سے زیادہ بیوی اور چار سال کی بیٹی کو چھوڑ کر ممبئی بھاگ جانا اور پھر کبھی مڑ کر نہ دیکھنا، ان سب واردات کی کڑیاں جمع کر کے ایک المناک کہانی بن گئی جو کوشل ورما کے خوابوں کو بھاپ بنا کر اڑا لے گئی۔

اس کے باوجود کوشل ورما ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔ ذات کا راجپوت تھا۔ اس

نے اپنا دماغ لڑایا اور فیصلہ کیا کہ کوشکی کو بہلا پھُسلا کر یا کسی اور طریقے سے اپنے قبضے میں کر لے گا۔ اس نے ممبئی میں رہ رہی اپنی گرل فرینڈ سے رابطہ کر کے اسے یہ کام سونپ دیا۔

کوشل ورما کی گرل فرینڈ نے جونہی ماجرا سنا، وہ جھٹ سے سمجھ گئی کہ باپ کو اتنی مدّت کے بعد بیٹی کی یاد نہیں آئی ہے بلکہ بیٹی کی دولت کھینچ لائی ہے۔ پھر سوچنے لگی کہ کیوں نہ میں بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھولوں۔ کوشل ورما نے اپنے سپنے میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کی لڑکی کا، جس کو اس نے کیلے کے چھلکے کی مانند ڈسٹ بِن میں پھینک دیا تھا، ستارہ اس طرح چمکے گا اور وہ اتنی دولت مند بن جائے گی۔ اپنے دوست کی رہنمائی میں گرل فرینڈ نے پہلے تو کوشکی کا موبائل نمبر پتہ کیا اور پھر اس سے بحثیت فین کے ملنے کا سمئے مانگ لیا۔ کوشکی تو نوخیز اور سیدھی سادی لڑکی تھی، لوگوں کی چالوں سے بے خبر، سو اس نے اپنے ہی گھر پر اسے مدعو کیا اور بزرگ پا کر آنٹی کہہ کر خطاب کیا۔

"نمستے آنٹی، کیسی ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ کو دیکھنے کا بڑا من کرتا تھا۔ آپ کی تو میں سب سے بڑی فین ہوں۔ آپ کی بلے بازی اور گیند بازی دونوں بے نظیر ہیں۔ اتنے کم سمئے میں آپ نے بہت نام کمایا، یہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔"

"تھینکس، آنٹی۔"

کوشکی نے کام والی بائی کو کہہ کر اس کے لیے چائے اور ناشتہ منگوایا اور دونوں چائے پینے میں مشغول ہو گئے۔ ساتھ ہی گفتگو بھی ہوتی رہی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں اور کچھ ذاتی باتیں۔ آنٹی نے موقع پا کر سوال پوچھا۔ "بیٹی آپ نے کسی اخبار میں انٹرویو دیا تھا کہ آپ کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے مگر میں نے سُنا ہے کہ آپ کا باپ زندہ ہے اور وہ یہیں کہیں ممبئی میں کام کر رہا تھا، پھر بیوی کے گزر جانے کی خبر سن کر واپس پرہلادپور چلا گیا۔"

کوشکی یہ سن کر خبردار ہو گئی مگر اس نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا جس سے آنٹی کو شک ہو جاتا۔ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "ایسی بات ہے کیا، مجھے اس بارے میں کچھ معلوم

نہیں۔"

"اوہ، پھر تو یہ بہت بری بات ہے کہ ایک دوسرے کی خبر بھی نہیں۔ بیٹی، جیسا کہ میں نے سنا ہے وہ تمھاری محبت میں دیوانہ ہو چکا ہے اور چاہتا ہے کہ تم واپس اس کے پاس چلی آؤ۔ اخبار کے کسی رپورٹر نے اسے اس بارے میں پوچھا بھی تھا اور اس نے اپنی فیملی سے بچھڑنے کا غم اور تم سے ملنے کی شدید خواہش ظاہر کی تھی۔ بیٹی میرا تجربہ کہتا ہے کہ دنیا میں ماں باپ سے بڑھ کر اور کوئی نہیں ہوتا۔ سکھ دُکھ میں بس وہی ساتھ دیتے ہیں۔"

"آنٹی، یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ اسے میری تلاش ہے۔ ابھی تو میں فی الحال کرکٹ ٹور کے ساتھ بزی رہوں گی، مجھے دو مہینے کے لیے انڈیا سے باہر جانا پڑے گا۔ واپسی پر میں تم سے رابطہ کرلوں گی۔"

آنٹی نے جلدی سے کاغذ پر اپنا اور کوشل ورما کا ٹیلیفون لکھ کر دے دیا۔ اس کے بعد آنٹی نے کوشکی سے اجازت لی اور وہاں سے رخصت ہوگئی۔

دو مہینے ہوگئے... تین مہینے ہوگئے... اور پھر چار مہینے ہوگئے... مگر نہ تو کوشکی نے آنٹی کو ٹیلیفون کیا اور نہ ہی کوشل ورما کو۔ کوشل ورما تیر کھائے اس پرندے کی طرح تڑپنے لگا جو اڑنا چاہتا ہو مگر اڑ نہیں سکتا یہاں تک کہ اسے اپنے لیے دانے چُننے کی بھی سکت نہیں ہوتی۔ وہ سوچتا رہا اور آخر کار اپنے ایک وکیل دوست سے مشورہ لیا۔ وکیل کسی کا سگا نہیں ہوتا، اسے اپنی آمدنی سے غرض ہوتی ہے، اس لیے اس نے کورٹ میں جانے کی صلاح دی۔

(۲۵)

کوشل ورما کے وکیل نے نچلی عدالت میں کوشکی کے بارے میں دعویٰ جما دیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ کوشکی مدعی کوشل ورما کی حیاتیاتی بیٹی ہے۔ بچپن میں پرہلاد پور کے زلزلے کی افراتفری میں اس کو اغوا کیا گیا تھا اور بہت ڈھونڈنے کے بعد بھی وہ نہیں ملی

تھی۔اس لیے پولیس نے کیس بند کیا تھا۔حال ہی میں کوشکی کا ایک انٹرویو شائع ہوا تھا جس سے پتہ چلا کہ اس کو یتیم خانہ چلانے والی ایک عیار عورت سُچیتا راٹھور نے اپنی ایک مددگار مانسی موسی کے ذریعے ورغلایا تھا اور پھر اس کو اپنے یتیم خانہ میں قید کر دیا تھا۔دراصل اس کارروائی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ کوشل ورما سُچیتا کے گھر سے اپنی برات واپس لے کر آیا تھا کیونکہ اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ بدچلن ہے اور کسی اور لڑکے کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔اسی کا بدلا لینے کے لیے یہ سازش رچائی گئی۔

جج نے وکیل کی دلیلِ کامل سنی اور پھر سُچیتا راٹھور اور مانسی موسی کو سمن جاری کرنے کا حکم جاری کیا۔دونوں کو جونہی عدالت کا سمن مل گیا انھیں ہزار وولٹ کا کرنٹ سا لگا۔بے چاروں نے کبھی عدالت کا باہری دروازہ بھی نہیں دیکھا تھا،اندر جانے کی تو بات ہی نہیں تھی۔مگر اب کیا ہوتا،جو ہونا تھا سو ہو گیا۔کوئی اس میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔تاہم اچھی بات یہ تھی کہ موبائل کا زمانہ آ چکا تھا۔سُچیتا نے وِدوشی سے موبائل پر بات کی اور سارا ماجرا بیان کیا۔وِدوشی نے اسے آشواسن دیا کہ ایسے واقعات کا سامنا تو وہ ہر روز کرتی ہے اور اس میں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔اس نے بغیر وقت گنوائے عدالت میں نالش کو خارج کرنے کی درخواست دی کیونکہ اس میں جو بھی معلومات دی گئی تھیں وہ حقیقت سے کوسوں دور تھیں۔

عدالت میں مقدمے کی تاریخ ایک مہینے کے وقفے کے بعد مقرر کی گئی جس میں دونوں طرف کے وکیل حاضر تھے۔

منصف نے کافی بحث و مباحث کے بعد مدعی کے وکیل سے پوچھا کہ لڑکی جس کے بارے میں بات ہو رہی ہے،کیا وہ نابالغ ہے یا بالغ؟

جواب ملا:''جناب جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ نابالغ ہے۔''

''اوہ میں سمجھا۔آپ نے اپنی درخواست میں کہا ہے کہ پرہلاد پور میں جب بھونچال آیا تھا تو اسی میں مدعی کی بیوی کا انتقال ہو گیا اور اس کے بعد وہ بچی غائب کر دی گئی تھی۔مدعی خود ممبئی میں روزگار کی تلاش میں چلا گیا تھا۔بچی کی عمر اس وقت کیا تھی کیونکہ اسپتال کے

رجسٹریشن کلرک کے مطابق وہ کوئی چار پانچ سال کی لگ رہی تھی، باتیں کر رہی تھی اور اپنے پاؤں پر چل پھر رہی تھی۔ وہ ماں کے ساتھ اسپتال میں لائی گئی تھی۔''

''یوؤر آنر، ہوسکتا ہے کہ دو تین سال کی ہو۔''

''جب اس کے باپ نے زلزلے کے بارے میں سنا، وہ کتنے روز کے بعد پہنچ گیا اور وہاں کیا پایا؟''

''وہ تو اسی روز ممبئی سے چل پڑا اور دو دنوں کے اندر پر ہلاد پور پہنچ گیا۔ وہاں سب کچھ تہس نہس ہو چکا تھا اور اس کی بیوی چھت گرنے سے زخمی ہو کر اسپتال پہنچائی گئی تھی۔ کوشل ورما نے اسپتال میں بھی دریافت کیا اور پتہ چلا کہ کسی بوڑھی عورت نے اس لڑکی کو ماں کے پہلو سے اٹھا کر اغوا کر لیا تھا۔''

''پھر تو مدعی نے پولیس تھانے میں رپورٹ بھی درج کرائی ہو گی؟ اس کی کوئی کاپی ہے آپ کے پاس؟''

''یوؤر آنر، وہ تو اتنا پریشان ہو گیا تھا کہ رپورٹ لکھوانا تو دور کی بات اس کا ذہنی توازن ہی بگڑ گیا تھا۔ ایک تو بیوی مر گئی تھی اور اس پر اکلوتی بیٹی غائب ہو گئی تھی جس کو اس نے بہت ڈھونڈا مگر کہیں نہیں ملی۔ وہ بے چارہ تو ڈھنگ سے کچھ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اور پھر ان دنوں حالات ہی ایسے تھے کہ ہر طرف ہُو کا عالم تھا، پولیس بھی بہت زیادہ پریشان رہتی تھی۔''

اس دوران مدعا علیہ کے وکیل نے عدالت سے کچھ کہنے کی اجازت چاہی جو اسے دی گئی۔ اس نے کہا:

''جج صاحب، اس بات کی تصدیق کوئی نہیں کر سکتا کہ کوشکی حقیقت میں کوشل ورما کی ہی بیٹی ہے۔ یہ تو اس کا ڈی این اے ٹیسٹ کر کے ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ البتہ سچ تو یہ ہے کہ کوشکی کے باپ نے اس کی ماں اور اس کو بھونچال سے بہت پہلے ہی چھوڑ دیا تھا اور اپنا کوئی اتا پتا یا ایڈریس بتائے بغیر غائب ہو چکا تھا۔ اس نے نہ کبھی مڑ کر دیکھا تھا اور نہ کبھی پتنی اور بیٹی کی مالی امداد کے لیے کوئی رقم بھیجی تھی۔ رہا سوال کوشکی کا کہ وہ اس وقت کتنی بڑی تھی، اس

بارے میں میری گزارش ہے کہ پولیس میں رپورٹ درج ہوئی تھی، تھانہ انچارج سے اس کی گمشدگی کی فائل منگوادیں اور اس سے بہت کچھ پتہ چل جائے گا۔"

منصف نے مقامی تھانے کے سربراہ کو حکم جاری کیا کہ وہ دس روز میں کوشکی کی گمشدگی کی فائل عدالت میں پیش کرے۔ کوشل ورما اور اس کے چالاک وکیل کو تو پہلے ہی سے اندازہ تھا کہ ایسا ہونے والا ہے، اس لیے دونوں نے مل کر پہلے ہی تھانیدار کی مٹھی خوب گرم کی تھی تاکہ وہ عدالت میں کہے کہ اس کیس کی کوئی فائل ہمیں نہیں مل رہی ہے اور ہوسکتا ہے کہ ایسا کوئی کیس رجسٹر ہی نہیں ہوا ہو۔ تھانیدار نے مزید اس بات پر بھی زور دیا کہ یتیم خانے کی منتظمہ کے لیے یہ ناگزیر تھا کہ وہ کمسن لڑکی کے مل جانے کی اطلاع پولیس کو فوراً دے دیتی تاکہ پولیس اس معاملے میں چھان بین کر سکتی۔

منصف نے جب یہ بات پولیس تھانہ کے ذمہ دار افسر کے منہ سے سن لی تو اسے یقین ہو گیا کہ اس لڑکی کے بارے میں کہیں کوئی لکھا پڑھی نہیں ہوئی ہے اور ممکن ہے کہ وہ نابالغ ہو۔ نابالغ لڑکی کو عدالت میں بلانے کے بارے میں وہ شش و پنج میں تھا۔ دریں اثنا مدعا الیہ کی وکیل نے منصف کے سامنے ایک اشتہار پیش کیا جو اس وقت کے تھانہ انچارج نے دو قومی اور کچھ مقامی اخباروں میں چھپوایا تھا۔ اس میں لڑکی کے ملنے کے بارے میں پبلک کو اطلاع دی گئی تھی، اس کی قد کاٹھی کے بارے میں تفصیل درج تھی اور اپیل کی گئی تھی کہ اگر اس لڑکی کا کوئی رشتے دار ہو یا اس کو جانتا ہو تو وہ فوراً پولیس تھانے سے رجوع کرے۔ اس کا مطلب تھا کہ موجودہ تھانہ انچارج نے سراسر جھوٹ بولا تھا اور کوشل ورما کی طرفداری کی تھی۔ منصف نے تھانہ انچارج کے خلاف بڑے ہی سخت الفاظ استعمال کیے اور اس کے اعلیٰ افسر کو اس کی بے ایمانی سے آگاہ کیا۔

مذکورہ اشتہار سے صاف ظاہر تھا کہ پرہلاد پور میں پندرہ سال پہلے زلزلہ آیا تھا اور اُس وقت کوشکی چار سال کی ہو چکی تھی۔ غرضیکہ اب وہ بالغ ہو چکی ہے اور اس کو کورٹ میں بلانے میں کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ انجام کار کوشکی کو کورٹ میں ایک مہینے کے بعد حاضر

ہونے کے لیے سمن جاری کیا گیا۔

اگلی سنوائی میں کوشکی کورٹ میں حاضر ہوئی۔ وِدوشی نے، جو مدعا علیہ کی وکیل تھی، اسے پہلے ہی سمجھایا تھا کہ کورٹ میں کسی سے ڈرنا نہیں اور جو سچ ہے اس کو بولنے میں جھجکنا نہیں۔ ہاں جو بھی بولو سوچ سمجھ کر بولو۔

جج صاحب نے کوشکی سے پہلا ہی سوال عمر کے بارے میں کیا: ''تمھاری عمر کتنی ہے؟''

''سر، میں انیس سال کی ہوگئی ہوں۔''

''جب تمھارے گاؤں میں بھونچال آیا تھا، کیا تمھیں اس کی کچھ سُدھ بُدھ ہے؟ کیا تم اس کے بارے میں بتا سکتی ہو؟''

''سر، میں اس وقت چار سال کی تھی اور سب کچھ سمجھ لیتی تھی۔ میں اپنی ماں رجنی ورما کے ساتھ رہتی تھی جس کو میرا باپ کوشل ورما چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ جب تک وہ گھر میں رہتا تھا میری ماں کو بات بات پر مارتا پیٹتا تھا اور اس کا جینا حرام کرتا تھا۔ میں وہ منظر نہیں دیکھ پاتی تھی اور کونے میں جا کر روتی رہتی تھی۔ اس کے جانے کے بعد وہ بے چاری اپنے زیور بیچ بیچ کر زندگی گزار رہی تھی۔

ایک روز اچانک زبردست بھونچال آیا اور سب کچھ تہس نہس ہوگیا۔ ہمارے مکان کی چھت ماں کے اوپر گر گئی۔ اس وقت میں باہر کھیل رہی تھی۔ میں نے پڑوسیوں سے گوہار لگائی۔ وہاں پر موجود کچھ نوجوانوں نے میری ماں کو بچانے کی کوشش کی اور اس کو اسپتال پہنچا دیا۔ میں بھی ان کے ساتھ ہی اسپتال چلی گئی۔ وہاں پر ماں نے آخری سانس لی۔ میں اسپتال کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر زاروقطار رونے لگی۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کہاں جاؤں۔ کسی کو جانتی پہچانتی نہیں تھی۔ اتنی دیر میں بھگوان جی نے ایک دیوی کو بھیج دیا جس نے میری حالت پر ترس کھایا اور مجھے اپنے ساتھ لے گئی۔ موسی نے مجھے ایک یتیم خانے میں بھرتی کرایا جس کو چلانے والی ہماری میڈم ہے جس کا نام سُچیتا راٹھور ہے۔ وہ تو فرشتہ ہے فرشتہ۔ اس نے نہ جانے کتنے بچوں کو اپنے وَردان اَناتھ آشرم میں پناہ دی ہے اور انھیں ماں کی طرح پالتی ہے۔

اس نے بچوں کی پڑھائی کے لیے پاس میں ہی ایک اسکول بھی کھولا ہے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ مجھے پڑھنے لکھنے سے زیادہ کرکٹ کھیلنے میں دلچسپی ہے تو اس نے مجھے ممبئی میں ایک کوچ کے پاس بھجوا دیا جہاں میں دو ڈھائی سال تربیت لیتی رہی اور وہیں سے قومی کرکٹ ٹیم کے لیے منتخب ہو گئی۔''

جج صاحب نے ساری کہانی صبر و تحمل کے ساتھ سن لی اور پھر ایک اور سوال کیا: ''کیا تمھارے پِتا جی نے کبھی تمھیں ڈھونڈنے کی کوشش کی، پولیس کے ذریعے یا پھر اخبارات، ریڈیو یا ٹی وی کے ذریعے؟''

''ان کے لیے میں اور میری ماں کبھی وجود ہی نہیں رکھتی تھی۔ ہم تو ان کے لیے کب کے مر چکے تھے۔ وہ بھلا مجھے کیوں کر ڈھونڈ لیتے۔ انھوں نے نہ تو کبھی ماں کے بارے میں اور نہ میرے بارے میں تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ہاں، ابھی حال ہی میں قریب پندرہ سال بعد جب میرا قومی اخبار میں انٹرویو شائع ہوا تھا اور میں نے اپنی زندگی کے بارے میں سب کچھ بیان کیا تھا تو انھوں نے کسی عجیب سی عورت کو میرے ممبئی کے فلیٹ پر مجھے رِجھانے کے لیے بھیج دیا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے ٹیلی فون پر کئی بار جان سے مارنے کی دھمکیاں بھی ملیں۔ شاید ان کو میری مالی خوشحالی کا اندازہ ہو چکا ہے اور جس طرح انھوں نے میری ماں کی دولت کو چوس چوس کر ختم کر دیا ویسے ہی اب وہ میری کمائی پر طفیلی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ سر، سچ پوچھو تو ہی از اے مونسٹر... آئی ہیٹ ہِم.... وہ عفریت ہے اور مجھے اس آدمی سے سخت نفرت ہے۔''

''کوشِکی جی، قرائنِ شہادت سے یہ صاف ظاہر ہے کہ تم بالغ ہو چکی ہو۔ اس لیے میں تمھاری رائے جاننا چاہتا ہوں؟ کیا تم اپنے پِتا جی کے پاس رہنا چاہتی ہو، اگر نہیں تو پھر تم کیا کرنا چاہتی ہو؟''

''سر، میں کسی پِتا جی وِتا جی کو نہیں جانتی اور نہ کسی ایسے آدمی کے پاس رہنا چاہتی ہوں جس نے میری ماں کو تِل تِل کر مارنے کی کوشش کی۔ میں اکیلے زندگی جی سکتی ہوں اور آگے بھی جینے کی کوشش کروں گی۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گی کہ میری ایک ماں سمان گارجین ہے جس کی

میں دن رات پوجا کرتی ہوں، وہ چاہے تو میں اس کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔ سُچیتا جی کا قرض تو میں اس جنم میں کیا آگے بھی کئی جنموں میں نہیں اُتار سکتی ہوں۔ اس دنیا میں میری بس وہی ایک ماں ہے اور ایک مانسی موسی ہے، اور کوئی نہیں۔"

جج صاحب نے دونوں وکیلوں کے دلائل اور گواہوں کے بیانات سنے اور آخر کار بالغ کوشِکی کے بیان پر بھی غور کیا۔ اس کے بعد اس نے اپنا حکم ریزرو کر لیا۔ اگلی تاریخ ایک مہینے کے بعد دی گئی۔ اگلی پیشی میں دونوں وکلا حاضر تھے اور جج صاحب نے اپنا فیصلہ پڑھ کر سنایا جس کا لب لباب یہ تھا کہ قرائنی ثبوتوں سے صاف ظاہر ہے کہ کوشِکی بالغ ہے اور اپنا بھلا بُرا سمجھ سکتی ہے۔ بقول کوشِکی اس کے حیاتیاتی والد نے اس کی ماں اور اس کو بے سہارا چھوڑ دیا تھا اور بعد میں زلزلے کے باعث اس کی ماں کا انتقال ہو گیا اور انجام کار وہ کہیں کی نہ رہی۔ اس کی حالت پر ترس کھا کر اس کو ایک یتیم کھانے میں بھرتی کیا گیا جہاں اس کی برسوں پرورش ہوئی اور ایسی ہوئی کہ وہ آج ایک نامور کرکٹ کھلاڑی بن چکی ہے جس کے لیے سُچیتا راٹھور کی جتنی تعریف کی جائے اتنی کم ہے۔ اس نے نہ صرف اس بچی کی زندگی محفوظ کر لی ہے بلکہ یتیم اور بے سہارا لڑکیوں کی پرورش کرنا اپنی زندگی کا نصب العین بنایا ہے۔ مدعی کے وکیل کا یہ الزام کہ کوشِکی کو اِغوا کیا گیا تھا اور اس کو اپنے باپ سے اتنے برسوں ملنے نہیں دیا گیا سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ اس کے برعکس یہ ثابت ہوتا ہے کہ کوشل ورمانے ہی اپنی بیوی اور بچی کو بے سہارا چھوڑ دیا تھا اور خود ممبئی بھاگ گیا تھا۔ اس لیے سُچیتا راٹھور اور مانسی موسی پر لگائے گئے سبھی الزامات کو میں رد کرتا ہوں اور حکم دیتا ہوں کہ کوشِکی کو جہاں مرضی، جدھر مرضی اور جس کے ساتھ مرضی ہو، وہ رہ سکتی ہے اور اس کے ساتھ ہی میں یہ کیس خارج کرتا ہوں۔ یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ کوشِکی کو کئی بار ڈرانے دھمکانے کی کوششیں کی گئیں جس کے لیے میں ممبئی پولیس کو ہدایت کرتا ہوں کہ وہ کوشِکی کی حفاظت کا پورا پورا انتظام کرے۔

فیصلہ سن کر سُچیتا، مانسی موسی اور وِدوشی بہت ہی خوش ہوئیں۔ سبھی وَردان آشرم چلی گئیں اور وہاں پر زبردست ہنگامہ کر لیا۔ اس کے بعد کوشِکی کو ممبئی کی ٹرین میں چھوڑنے کے لیے سب

اس کے ساتھ ہو لیے۔ ہفتے بھر کے بعد ہی کوشکی کو اپنی قومی ٹیم کے ساتھ جنوبی افریقہ کے لیے روانہ ہونا پڑا۔

کوشکی کی اس جیت کے سبب وِدوشی کو مارکنڈے پُران کی وہ کوشکی دیوی یاد آئی جس نے پاروتی کی میان سے جنم لیا تھا اور دو خونخوار اسُر بھائیوں، شُمبا اور نِشُمبا، کو ان کی پوری فوج کے ساتھ ختم کر دیا تھا۔ آج ظاہر ہے کہ اسی کوشکی دیوی کا ایک اور روپ سامنے آیا تھا۔

(۲۶)

ایمرجنسی کے بعد ہندوستانیوں کی سوچ و فکر میں زمین و آسمان کا فرق آ گیا۔ آزادی کے ٹائم پر ہندوستانی اشتراکیوں کو بالراست کامیابی نہیں ملی اور ان کی جگہ میانہ رو سیاسی جماعت نے لے لی پھر بھی ان کا دائرۂ اثر رائیگاں نہیں گیا۔ اس میں ہوسکتا ہے کہ کوئی مصلحت درکار رہی ہو کیونکہ انگریزوں کو یہ اندیشہ رہا ہوگا کہ اگر انھوں نے کمیونسٹوں کو عنان حکومت سونپ دی تو دوسرے ملکوں کی طرح یہاں بھی طبقاتی جدوجہد شروع ہو جائے گی اور بڑے پیمانے پر خون خرابہ ہوگا۔ اس افراتفری میں ممکن ہے کہ خود انگریزوں پر بھی آنچ آ جائے۔ وہ انگریز جو سرکار چلا رہے ہیں یا پھر ان کے حمایتی ہیں اور ان کے کنبے جو ہندوستان میں ہیں، اگر ان ہنگاموں کی زد میں آ گئے تو ان کی موت یقینی ہوگی۔ اس لیے انھوں نے مصلحتاً حکومت میانہ رو فیبین سیاست دانوں کے ہاتھوں میں سونپ دی جو ان کے تحفظ کے لیے عہد بستہ تھے۔ اس حکمت عملی کی ایک اور مثال تب سامنے آئی جب پنجاب میں جرنیل سنگھ بِندرانوالا نے اکالی سیاست پر قبضہ کر لیا اور اس کو حاجز کرنے کے لیے کانگریس نے میانہ رو اکالی رہنماؤں جیسے پرکاش سنگھ بادل اور لونگووال کے ہاتھ میں پنجاب کی باگ ڈور دے دی۔

میانہ روی نے ان سیاست دانوں کو عجیب مخمصے میں ڈال دیا۔ وہ دل سے چاہتے تو سوشلزم تھے مگر انقلاب اور خون خرابے کے خیال سے خوف زدہ تھے۔ حالانکہ ان کی اس احتیاط

کے باوجود بٹوارے کے دوران ایسے سانحات وقوع پذیر ہوئے جن کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ بہرحال ان کے وجوہات قدرے مختلف تھے۔ ہندوستانی نظام نہ سرمایہ دارانہ نظام بن گیا اور نہ ہی اشتراکی، بلکہ درمیان میں ترشنکو کی مانند لٹکتا رہ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ افسر شاہی، لائسنس راج، رشوت خوری اور اقربا پروری نے ہماری معیشت کی کمر توڑ دی۔ جمود اور سست رفتاری ہماری پہچان بن گئی اور ہماری ترقی کو طنزاً 'ہندو شرح' کہا جانے لگا۔ سڑکوں پر کئی دہوں تک لمبریٹا اسکوٹر، ایمبیسڈر، فیٹ، اسٹینڈرڈ کاریں اور ٹاٹا ٹرک نظر آتے رہے جو چلتے کم تھے اور دھواں زیادہ چھوڑتے تھے۔ منصوبہ بندی کی آڑ میں بھاری صنعتوں پر زور دیا گیا جبکہ زراعت کو یکسر نظرانداز کیا گیا۔ نتیجے میں ساتویں دہائی تک ہمارا ملک اناج درآمد کرتا رہا۔ حد تو یہ رہی کہ ہمارے رہنما فوج کو بے مصرف ولا حاصل سمجھتے تھے اور اس ادارے پر خرچہ کرنا غیر ضروری گردانتے تھے۔ انجام کار چین کے ساتھ ہوئی جنگ میں ہماری فوج کے پاس نہ پہننے کے لیے گرم کپڑے تھے اور نہ ہی لڑنے کے لیے ہتھیار و گولہ بارود۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ پانچ سالہ منصوبہ بندی کے تحت کئی بڑے کارخانے نصب کیے گئے مگر سیاسی مداخلت اور سرخ فیتہ شاہی اتنی حاوی تھی کہ ان کا ثمر بالراست عوام کو نہیں مل رہا تھا۔ دفتری طوالت، بنیادی اشیا کی کمیابی اور حد سے بڑھتی گرانی اس سب ترقی پر پانی پھیر رہی تھی۔ پرائیویٹ سیکٹر کے فقدان اور مسابقت کی عدم موجودگی کے باعث پیداواریت میں بہت کمی آگئی اور ہمارے ملک کو اس کا مستقل خمیازہ اٹھانا پڑا۔ بھلا ہو نارمن بورلاگ اور ایم ایس سوامی ناتھن کا جنھوں نے آزادی کے قریباً بیس سال بعد 'سبز انقلاب' کے ذریعے ہماری زراعت کا نقشہ بدل ڈالا۔ دوسری طرف ورگیز کورین نے قریباً پچیس سال بعد 'سفید انقلاب' کے توسل سے ہندوستان میں دودھ کی نہریں بہادیں۔ بہرکیف ان سب اقدامات کے باوجود ہمارا ملک آٹھویں دہے کے آخر تک غیر ترقی یافتہ اور پسماندہ رہ گیا۔ نویں دہائی کے اوائل میں سرکار کی سوچ میں خاصی تبدیلی آگئی اور پابند معیشت کی جگہ آزاد معیشت نے لے لی۔ لیکن یہاں تک آتے آتے بہت دیر ہو چکی تھی اور اس درمیان ہم ترقی کے راستے پر

بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ پھر بھی کہتے ہیں نا کہ دیر آید درست آید۔

بیسویں صدی میں برقیات اور تکنالوجی کے میدان میں جتنی تبدیلی دنیا میں آئی ہے، کہتے ہیں کہ اس سے پہلے انیس صدیوں میں اتنی نہیں آئی تھی۔ وقت بدلنے کے ساتھ ہندوستانی سیاست دانوں کی سوچ بھی بدل گئی۔ اب تو کچھ ایسے بھی سیاست دان میدان میں اترے جن کی سوچ ہی نرالی تھی۔ وہ نہ تو سوشلزم اور نہ ہی سرمایہ داری کی بھٹی میں تپ کر نکل آئے تھے۔ سائنس اور تکنالوجی سے لیس ان نوجوانوں نے ملک کو آگے بڑھانے کی ٹھان لی۔ کھلے مارکیٹ کی معیشت، غیر ملکی سرمایے کی آمد اور صنعتی انقلاب کے باعث ہندوستان نے جدت طرازی اور ترقی کی دوڑ میں لمبی چھلانگ لگائی۔ ملک کے اساسی بنیادی ڈھانچے جیسے سڑک، بجلی اور پانی کی دستیابی پر فوکس کیا گیا۔ اس پر طرّہ یہ کہ کمپوٹر اور انٹرنیٹ کی شروعات اور اس کے بعد موبائل کے چلن نے یہاں کی معیشت کو مہمیز لگا دی۔ سچ تو یہ ہے کہ انٹرنیٹ اور موبائل تکنالوجی نے ملک میں ایک نیا ہی ماحول پیدا کیا۔ ایک جانب کئی جگہوں جیسے بنگلور اور حیدرآباد میں سوفٹ وئیر صنعتوں کے مراکز بن گئے اور دوسری جانب سوفٹ وئیر کی برآمدات میں کئی گنا بڑھوتری درج کی گئی۔ تعلیم یافتہ نوجوان ان دو میدانوں میں تربیت پانے کے لیے قطار باندھنے لگے اور اُدھر دور دراز کسانوں کے ہاتھوں میں موبائل آنے سے زراعت میں بھی انقلاب آ گیا۔

اس دوران میں بھوانی پور کی کایا ہی پلٹ چکی تھی۔ اب وہ گاؤں نہیں بلکہ چھوٹا سا شہر لگنے لگا تھا۔ یہاں کے رسل و رسائل اور دیگر وسائل بہت ترقی کر چکے تھے۔ آبادی بھی کافی بڑھ چکی تھی۔ سُچیتا راٹھور کی رہبری میں یہاں کے لوگوں نے خود کئی چھوٹے اور درمیانی درجے کی صنعتیں لگائی تھیں جبکہ باہر سے بھی کچھ صنعت کار یہاں صنعتیں لگانے کے لیے وارد ہوئے تھے۔ علاقے کے موسم میں خاصی تبدیلی آ چکی تھی۔ جگہ جگہ گڑھے کھود کر تالاب بنانے اور بہ افراط شجر کاری کے سبب سوکھی زمین پڑا جانے کی بجائے اب ہری بھری نظر آ رہی تھی۔ کسانوں نے ریتیلی زمین کے موافق مختلف دالیں اور اناج اُگانا شروع کر دیا تھا۔ اس ترقی کو

دیکھ کر سرکاری انتظامیہ بھی حرکت میں آ گیا تھا۔ ان سے جتنی مدد ہو سکی، اتنی کر دی۔ سُچیتا راٹھور کی مانگ اور علاقے کے منتخب نمائندوں کے اصرار پر سرکار نے دو سو کلومیٹر دور دریا سے یہاں تک نہر کھودنے کو منظوری دی تھی اور اب یہ نہر اس علاقے کو باضابطہ طور پر سیراب کر رہی تھی۔ اس کے توسل سے یہاں کی زمین کی نمی میں بہت اضافہ ہوا ہے۔

پختہ سڑکوں، پانی و بجلی کی فراہمی اور مواصلات کی دستیابی کے سبب کئی جانے مانے صنعت کاروں کو اس علاقے میں صنعتیں لگانے کی ترغیب ملی۔ انجام کار گاؤں کے اس مجموعے میں کیمیات وادویات، برقی سامان و برقیاتی آلہ جات، پلاسٹک اور فرنیچر کے کارخانے نصب کیے گئے جن کے باعث گرد ونواح کے علاقوں سے ہنر مند، نیم ہنر مند اور بے ہنر مزدور یہاں کام ڈھونڈنے چلے آئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ بتدریج اس علاقے کی آبادی اتنی بڑھ گئی کہ پاس پڑوس کے قصبے اس کے مقابلے میں چھوٹے دکھائی دینے لگے۔ اس شہر نما علاقے کی وسعت کو دیکھ کر سرکار نے اس کو قریبی بڑے ریلوے اسٹیشن سے ریل کے ذریعے ملا دیا۔ اب یہاں ریل گاڑی ہفتے میں تین بار آتی ہے۔

یہ کرشمہ ایک دن، ایک ہفتہ یا ایک سال میں نہیں ہوا۔ اس کام کو اس مرحلے تک پہنچانے میں دس سال سے زیادہ عرصہ لگا۔ سبھی گاؤں کے لوگ خاص کر عورتیں اس ترقی کو حاصل کرنے میں برابر کے شریک تھے۔ کچھ لوگ باہر سے بھی آئے اور مددگار بن گئے۔ پھر ان لوگوں کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جنھوں نے مالی امداد دے کر یا پھر صنعتیں لگا کر اس خطے کو اس لائق بنایا کہ آج یہ سب کی توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔ علاوہ ازیں سرکار اور عوام کے نمائندوں کی تن دہی اور محنت نے بھی سونے پر سہاگا کا کام کیا۔ الغرض یہ حصولیابی ساری برادری کی ہے جنھوں نے رات دن ایک کر کے کاتب تقدیر سے اپنی قسمت از سر نو لکھوائی ہے۔ تاہم اس سفر میں اگر کوئی نام سنہری الفاظ میں لکھنے کے قابل ہے وہ ہے سُچیتا راٹھور کا۔ وہ اس کارنمایاں کی روح رواں ہے جس نے ایک روز جون آف آرک کی مانند اپنے ہاتھ میں پرچم اٹھا لیا اور سبھی لوگ اس کے نقش قدم پر چلنے کے لیے آناً فاناً تیار ہو گئے۔ اس کے عزم، مصمم

ارادے، اخلاص، لگن، ثابت قدمی، ہمت اور حوصلے کی نظیر ملنا بہت مشکل ہے۔ اس نے نہ صرف اپنی ساری جائیداد بلکہ اپنی پوری زندگی لوگوں کی خاطر وقف کر دی اور اسی لیے کم عمر ہو کر بھی اتنی عزت کمائی کہ سبھی لوگ، چھوٹے و بڑے، اس کو 'دیدی' کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔

خود سُچیتا راٹھور کو یہ دیکھ کر تعجب ہو رہا ہے کہ بہت عرصہ پہلے اٹھائے گئے ایک چھوٹے سے قدم نے گاؤں کی کایا ہی پلٹ دی اور اب وہ شہر کی طرح ترقی یافتہ دکھائی دینے لگا ہے۔ بعض اوقات وہ صبح سویرے کھلی سڑک پر اکیلی ٹہلنے نکلتی۔ لمبی تارکول بچھی سڑک، ہوا میں جھولتے درخت، سرسراتے پتے، سڑک کی دونوں جانب کھڑے برقی کے کھمبے جن پر برقی تاریں دوڑتی چلی جا رہی ہیں، عبادت گاہوں سے ابھرتی دعائیں اور پھر کچھ دیر بعد کارخانوں کی سیٹیاں، یہ سب کچھ اسے بہت اچھا اور فرحت بخش لگتا ہے۔ اس کے تو گماں میں بھی نہ تھا کہ ایک دن ایسا سماں دیکھنے کو ملے گا۔ وہ وجد کی حالت میں شادماں ہو کر گھر کی جانب واپس قدم اٹھاتی۔

(۲۷)

رنبیر چوہان نے وَردان آشرم آنا چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہاں سب کچھ ڈھرّے پر چل رہا تھا اور اس کا اب وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ بہر حال وہ ہر سال رکشا بندھن کے تیوہار پر آشرم میں ضرور حاضری دیتا اور سُچیتا راٹھور اس کا بے صبری سے انتظار کرتی رہتی۔ کئی برس شانہ بشانہ ایک دوسرے کے ساتھ کام کرتے ہوئے وہ دونوں بھائی بہن کے پاک رشتے میں بندھ گئے تھے ۔پچھلے سال جب رکشا بندھن کے دن رنبیر چوہان وَردان آشرم کے دفتر میں چلا آیا اس وقت دفتر میں سُچیتا راٹھور نہیں تھی، وہ کسی ضروری کام سے باہر چلی گئی تھی۔ دفتر میں اس کی بڑی بیٹی وِدوشی حاضر تھی۔ چونکہ سُچیتا کو رنبیر کے آنے کا پورا یقین تھا وہ وِدوشی کو تنبیہ کر کے گئی تھی کہ میری غیر حاضری میں تم کہیں مت جانا اور جب تک میں نہ آؤں تب تک رنبیر کو جانے مت دینا۔

رنبیر کے ساتھ وِدوشی کی یہ پہلی ملاقات نہیں تھی۔اس سے پہلے بھی وہ ایک دو بار مل چکے تھے البتہ آج وہ پہلی بار روبرو ہوئے اور ایک دوسرے کو جاننے کی کوشش کرنے لگے۔گفتگو کے دوران دونوں نے ایک دوسرے سے اس کی زندگی،نصب العین، تجربات اور پسندیدگی کے بارے میں دریافت کیا اور جواب پا کر مطمئن ہو گئے۔گفتگو کی باریکیوں کا اندازہ لگا کر رنبیر چوہان نے اپنی اصلیت پر روشنی ڈالنا مناسب سمجھا:

''وِدوشی جی، دراصل میں اپنے نام کے ساتھ 'چوہان' تو لکھتا ہوں مگر میری ذات راجپوت ذات نہیں ہے بلکہ درجہ فہرست ذات ہے جس کے باعث عموماً لوگ دھوکہ کھاتے ہیں۔سوچا کہ آپ کو بتاتا چلوں۔''

''مجھے ان باتوں کی کوئی پروا نہیں۔آدمی ذات سے نہیں کرموں سے پہچانا جاتا ہے۔''

''جی آپ کا کہنا دُرست ہے۔''

''میں بھی کونسی راٹھور ہوں، رنبیر جی۔سُچیتا راٹھور تو کنواری ہے۔اس نے مجھے اور میترئی کو اَناتھ آشرم سے اٹھایا تھا اور بیٹیوں کی طرح پالا ہے۔اس نے بطور مجرد والدہ کے ہم کو اپنی بے لوث محبت سے مالا مال کیا ہے۔وہ نہ ہوتی تو نہ جانے ہم کہاں دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہوتے، میں تو اس بارے میں سوچ کر ہی گھبرا جاتی ہوں۔میری ذات کا کسی کو معلوم نہیں۔ہاں یہ لاحقہ تحفے میں ملا ہے جس کو اپنے نام کے ساتھ جوڑ کر پھرتی ہوں ورنہ میں کہاں اور راٹھور ذات کہاں؟''

''وِدوشی جی، ان ذاتوں اور القابوں میں کیا رکھا ہے؟ یہ تو انسان کی ذہنی اُپج ہے۔نہ جانے کیوں ہمارا معاشرہ انسان کی تخلیق کردہ ان بناوٹی دیواروں کو گرانے کی کوشش نہیں کرتا؟''

''یہ تو ہمارے سماج کا ایک اٹوٹ حصہ بن چکا ہے۔پانچ ہزار برسوں سے چلا آرہا ہے، مجھے نہیں لگتا کہ اس کا کبھی خاتمہ ہوسکتا ہے۔''

''جی آپ صحیح فرما رہی ہیں۔یہ ہمارے معاشرے کا ایک ناسور بن چکا ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔خیر چھوڑیے ان باتوں کو، یہ بتائیے کہ آج کل آپ کہاں ہیں اور کیا کرتی ہیں؟''

''میں نے حال ہی میں وکالت کی پڑھائی مکمل کی اور پھر تجربہ حاصل کرنے کے لیے جودھپور ہائی کورٹ میں ایک نامور وکیل کے ساتھ منسلک رہی۔ اب الگ پریکٹس کرتی ہوں۔ سپریم کورٹ کے ایک معزز وکیل نے مجھے اپنی شاگردی میں کام کرنے کی آفر دی تھی مگر میں نے ٹھکرائی کیونکہ میں اپنی ماں کے نزدیک رہنا چاہتی ہوں۔ سُچیتا ممی کا تو کوئی نہیں ہے میرے اور میترائی کے سوا۔ میترائی بھی کچھ مہینوں بعد ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کر کے نزدیک ہی شہر کے ایک بڑے اسپتال میں پریکٹس کرنے کی سوچ رہی ہے۔''

''وِدوشی جی، میری زندگی میں بھی بہت سارے اُتار چڑھاؤ آئے ہیں۔ ابھی میں چودہ برس کا بھی نہیں ہوا تھا کہ میرے والدین ریل حادثے کا شکار ہوگئے۔ گھر میں ایک معذور بہن ہے جو زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہے، بس گھر میں ہی بیٹھی رہتی ہے۔ ایک ہمدرد نے مجھے بھاسکر بھاردواج کے پاس بھیج دیا اور میں نے انھیں اپنی ساری بِپتا سنائی۔ انھوں نے مجھے اپنی کمپنی میں بطور مبتدی شاگرد کے رکھ لیا۔ چنانچہ ہم کرائے کے مکان میں رہتے تھے، انھوں نے مجھے اپنے گھر کے آوٹ ہاؤس میں تھوڑی بہت جگہ دی جہاں میں اور میری اپاہج بہن رہنے لگے۔ میں اپنی بلوغت تک کمپنی میں ہی حرفت اور مہارت کی سیڑھیاں طے کرتا گیا۔ ان دنوں مجھے روزینہ ملتا تھا جس سے ہم دونوں کا نباہ ہوتا تھا۔ آخر کار میری محنت ومشقت رنگ لائی اور بالغ ہوتے ہی بھاسکر صاحب نے مجھے بطور مارکیٹنگ منیجر کے تقرری کر دی اور میں باضابطہ تنخواہ پانے لگا۔ اس روز میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ بھاسکر صاحب کو مجھ پر اتنا بھروسہ ہوگیا کہ انھوں نے اِس علاقے میں بھیانک سوکھا پڑنے کے بعد مجھے سُچیتا جی کی مدد کرنے کے لیے بھیج دیا۔ بھگوان کی مہربانی سے میں اس مشن میں کامیاب ہوگیا۔ تب سے میں کمپنی میں مختلف کام سنبھالتا رہا ہوں۔ ہاں ایک بات اور۔ خالی وقت میں میں نے فاصلاتی تعلیم کے ذریعے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ بارہویں پاس کر کے گریجویشن مکمل کی اور اس کے بعد اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی سے ایم اے اور ایم بی اے کے امتحانات کامیاب کیے۔

''دیٹ از اے گریٹ اچیومنٹ۔ آئی ایم امپریسڈ۔ میری دعا ہے کہ بھگوان آپ کے

لیے زندگی کے اور بھی راستے کھول دے۔"

"شادی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ کوئی ڈھونڈ لیا ہے یا ابھی تلاش جاری ہے؟"

ایسا براہ راست سوال سن کر وِدوشی کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئی مگر پھر ہمت بٹور کر گویا ہوئی۔

"اُس کے بارے میں میری ماں ہی فیصلہ کرے گی۔ ابھی تک تو میں نے کسی کو پسند نہیں کیا ہے۔"

جواب دے کر وِدوشی جھینپ سی گئی تاہم کن انکھیوں سے رنبیر کو دیکھتی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ رنبیر کی جسمانی زبان دیکھ کر کچھ تو اندازہ ہوگا کہ یہ سوال پوچھنے کی غرض کیا تھی۔

اتنی دیر میں سُچیتا راٹھور آ گئی اور رنبیر کو دیکھ کر بہت خوش ہوگئی۔ آتے ہی بولی۔

"رنبیر، آئی ایم ویری سوری، مجھے ضروری کام سے جانا پڑا اور نہ میں صبح سے ہی تمھارا انتظار کر رہی تھی۔"

"نیور مائنڈ، مجھے تو یہاں بہت اچھی کمپنی مل گئی۔ سمئے بیتنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ وِدوشی جی کی شخصیت تو بہت متاثر کن ہے۔ ہم آپس میں تبادلہ خیال کرتے رہے، کچھ ذاتی زندگی کے بارے میں اور کچھ دنیا کے بارے میں۔ بہت ہی فائدہ مند مکالمہ رہا، وِدوشی جی کو اچھا لگا یا نہیں، یہ تو وہی بتا سکتی ہے۔"

"ممی، رنبیر جی بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ بڑے ذی علم اور تجربہ کار معلوم ہوتے ہیں۔"

دریں اثنا سُچیتا اپنی کرسی سے اٹھی اور پاس ہی کھڑی الماری سے ایک ڈبّہ نکالا جس میں راکھی اور پوجا کا سامان پڑا ہوا تھا۔ پہلے رنبیر کی پیشانی پر تلک لگایا، پھر اس کی کلائی پر راکھی باندھ لی اور اس کے بعد اسے گلے لگایا۔ رنبیر کو بہن کا یہ تحفہ نہ جانے کیوں آج زیادہ ہی محبتوں سے بھرا نظر آ رہا تھا۔ شاید اس میں بہت دیر سے ہوئی گفتگو کی چاشنی بھی ملی ہوئی تھی۔ چائے ناشتہ کر کے اس نے سُچیتا اور وِدوشی سے اجازت مانگی۔ وِدوشی بہت دیر تک دروازے پر اس کو

دیکھتی رہی۔

سُچیتا کو کچھ شک سا ہو گیا۔ تُرنت بیٹی سے پوچھا۔

''کیوں گفتگو ہی ہوئی یا پھر.....؟''

''ممی، آپ بھی ناں....'' اور اس نے شرما کر اپنا منہ چھپالیا۔

''اب سچ سچ بتادو کہ کیا بات ہے۔ مجھے تو دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے۔''

''ممی، پوچھ رہے تھے کہ میری شادی ہوئی ہے یا نہیں، میں نے کسی کو پسند کیا ہے یا نہیں؟ مگر میں نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ نہ تو میری شادی ہوئی ہے اور نہ ہی میں نے کسی کو ابھی تک پسند کیا ہے۔ میں تو ممی کی مرضی سے ہی شادی کروں گی۔''

''اوہ، تو بات یہاں تک پہنچ گئی ہے۔ خیر یہ بتاؤ کہ میں آگے بات بڑھاؤں یا نہیں۔ میرے خیال میں رنبیر بہت ہی اچھا لڑکا ہے، سمجھدار بھی ہے، ہمدرد بھی ہے اور مددگار بھی۔ تمھیں پسند ہو تو میری بھی ہاں سمجھ لو۔''

''ممی جیسا تم مناسب سمجھو۔''

اور پھر دوسرے روز ہی رنبیر چوہان کو پیش ہونے کا دوبارہ حکم صادر ہوا۔ وہ دوڑتا دوڑتا سُچیتا راٹھور کے سامنے پیش ہوا۔

رنبیر چوہان کو وِدوشی بہت پسند آئی تھی۔ اس نے واپس جا کر بھاسکر بھاردواج سے اس بارے میں بات کی تھی۔ دراصل بھاسکر صرف اس کا آجر ہی نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ چھوٹے بھائی کی طرح سلوک کرتا تھا۔ بہت برس پہلے جب رنبیر چوہان کے والدین سڑک حادثے کا شکار ہوئے تھے اس وقت رنبیر کو ایسا لگا تھا کہ سارا آسمان اس کے سر پر گر پڑا ہے۔ وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا تھا۔ اس کی ساری توانائی بھاپ بن کر ہوا میں اڑ گئی تھی۔ اس وقت بھاسکر نے اس کو اپنی شرن میں لیا تھا۔ چند روز بعد جب وہ اپنے والدین کی استھیاں گنگا میں ڈال رہا تھا، بھاسکر اس کے ساتھ کھڑا تھا اور ہمت نہ ہارنے کی نصیحت دے رہا تھا۔

''رنبیر، اس زندگی میں کب کیا ہوگا، کسی کو نہیں معلوم۔ ہم خود کو اپنی زندگی کا مالک سمجھتے

ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کی باگ ڈور کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ہمیں اپنی زندگی کے بارے میں پل بھر کی بھی خبر نہیں رہتی۔''

رنبیر بھاسکر کے کندھے پر سر رکھ کر زار و قطار رو رہا تھا۔الفاظ اس کے حلق میں اٹک رہے تھے۔کہنے لگا۔

''سر، مجھے فقط انہی کا واحد سہارا تھا۔رشتے دار وغیرہ تو اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف ہیں۔آپ نے شاید دیکھا ہوگا کہ انتم سنسکار کے سمئے دو چار ہی قریبی رشتے دار حاضر ہوئے تھے۔اب تو گھر کا سارا بوجھ مجھے ہی اٹھانا پڑے گا، ایک معذور بہن بھی تو ہے۔''

''رنبیر تم میرے آوٹ ہاوس میں رہو۔اپنی بہن کو بھی اپنے ساتھ رکھو۔''

بھاسکر نے دوبارہ اس کو گلے لگایا اور تسلیاں دیتا رہا۔تب سے وہ رنبیر کو اپنا چھوٹا بھائی ہی مانتا ہے اور اس کی ہر ضرورت پوری کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ رنبیر اس کا منظورِ نظر بھی ہے اور اس کا کام راز داری سے کرتا ہے۔سُچیتا راٹھور کے دفتر جانا اور قحط سالی میں اس کی رات دن مدد کرنا، سب کچھ بھاسکر کے اشارے پر ہی ہوتا رہا۔

رنبیر چوہان نے بھاسکر بھاردواج کے سامنے اپنے سارے پتے کھول کر رکھ دیے۔

''مجھے پورا یقین ہے کہ وِدوشی کو میں اپنا دِل دے بیٹھا ہوں، وہ سُچیتا راٹھور کی متبنیٰ بیٹی ہے، وکالت کا امتحان پاس کر چکی ہے اور اب جودھپور ہائی کورٹ میں وکالت کر رہی ہے۔بہت ہی ذہین اور حساس لڑکی ہے۔''

''تمھارے چاہنے سے کیا ہوتا ہے، وہ بھی تو تمھیں پسند کرنی چاہیے۔''

''مجھے بھروسہ ہے کہ وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے۔''

''تم کہہ رہے ہو کہ وہ متبنیٰ اولاد ہے۔کہاں سے اٹھا لائی تھی سُچیتا اس کو؟ تم نے معلوم تو کیا ہوگا۔''

''ہاں بھائی صاحب، جن دنوں سُچیتا جی پی ایچ ڈی کر رہی تھی انہی دنوں اس نے ایک یتیم خانے سے وِدوشی اور میترئی، دو لڑکیوں کو گود لیا تھا۔ایک وکیل بن گئی اور دوسری ڈاکٹری

کی تربیت پا رہی ہے۔ سُچیتا جی جب مجرد مادری پرورش میں کامیاب ہوگئی تو اسے بھوانی پور میں یتیم خانہ کھولنے کی تحریک مل گئی۔''

''پھر تو اچھی بات ہے۔ کہیں مستقبل میں تمھیں اس کے اَناتھ ہونے یا اس کی ذات کا پتہ نہ ہونے کا اعتراض تو نہیں ہوگا؟ اگر تمھیں اس بندھن میں بندھ جانا ہے تو آنکھیں کھول کر زندگی جی لینی پڑے گی۔ لوگ ہوسکتا ہے باتیں بنائیں مگر تمھیں ان سب باتوں کو درگزر کرنے کی اپنے آپ میں طاقت پیدا کرنی پڑے گی۔''

''جی ہاں، اس کے لیے تو میں نے خود کو تیار کر رکھا ہے اور کوشش کروں گا کہ وِدوشی کو کبھی اور کسی قسم کی تکلیف نہیں دوں گا۔''

''پھر تو تمھارے ساتھ میری اَشیرباد ہے۔''

''تھینک یو، بھائی صاحب۔''

اِدھر جب سُچیتا دیدی کا بلاوا آیا تو رنبیر فوراً سمجھ گیا۔ اس کی دائیں آنکھ پھڑک رہی تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ اس کی پیشی اسی وجہ سے لگی ہوگی۔ اس لیے تاخیر کیے بغیر ہی وہ سُچیتا راٹھور کے دفتر میں حاضر ہوا۔ وِدوشی وہاں پر موجود نہ تھی۔

''آؤ رنبیر، تمھارا ہی انتظار کر رہی تھی۔'' سُچیتا کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''آپ نے بلایا سو میں چلا آیا۔ کہیے کیا حکم ہے، دیدی؟''

''ارے حکم وُکم کی کوئی بات نہیں ہے۔ بات دراصل کچھ ذاتی نوعیت کی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ تم اور وِدوشی ایک دوسرے کو چاہنے لگے ہو۔ کیا یہ سچ ہے؟''

رنبیر کی آنکھیں شرم کے مارے جھک گئیں۔ اس نے نظریں نیچی کر کے جواب دیا۔

''ہاں دیدی، مجھے وِدوشی بہت پسند ہے۔ میں نے اپنے بھیّا، بھاسکر سے بھی اس بارے میں بات کر لی ہے اور انھوں نے بھی اَشیرباد دی ہے۔''

''وِدوشی سے اس بارے میں میری بھی بات ہو چکی ہے اور وہ بھی اس رشتے کے لیے راضی ہے۔ تم چاہو تو میں مہورت نکلوا کر شادی کا انتظام کرا دوں گی۔''

اس کے بعد سُچیتا نے وِدوشی کو بھی کمرے میں بلایا اور اس کو بھی اس رشتے کی منظوری کی خبر دی۔ پھر تینوں نے مل بیٹھ کر چائے ناشتہ نوش فرمایا۔ سُچیتا نے تو خاص طور سے موتی چور کے لڈو منگوائے تھے۔ سو سب کا منہ میٹھا کرادیا۔ کمرے میں قہقہوں کی پھلجھڑیاں پھوٹ رہی تھیں۔ صرف بھاسکر کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔

(۲۸)

اسی رات وِدوشی نے اپنی بہن میترئی سے موبائل پر بات کی اور اپنی شادی طے ہونے کی خبر دی۔ میترئی خوش خبری سن کر ہی اچھل پڑی۔ اس کے بعد وِدوشی نے وہاٹس اَپ پر رنبیر کے ساتھ اپنی تصویر بھی بھیج دی۔ ردِ عمل میں میترئی نے وہاٹس اَپ پر ویڈیو کال کر کے وِدوشی کو مبارک باد دی۔

''ہائے سِسٹر، بہت بہت مبارک ہو۔ تم نے تو بہت جلدی بازی ماردی۔ کم سے کم میرا انتظار تو کیا ہوتا۔''

''اری بہنا ایسا کچھ بھی نہیں۔ یہ سب اچانک ہو گیا۔ پنجابی میں اس کو کہتے ہیں 'چٹ منگنی پٹ بیاہ'۔ بات دراصل یوں ہے کہ لڑکا ممی کو جانتا ہے اور اس کو بہن بنا رکھا ہے۔ راکھی بندھوانے ممی کے آفس میں آ گیا، وہ آفس میں نہیں تھی اور میرا آمنا سامنا ہوا۔ اس سمئے میں وہاں اکیلی تھی۔ بہت دیر تک دل کھول کر آپس میں باتیں ہوئیں اور مجھے لگا کہ بندہ دل سے بھی اتنا ہی خوبصورت ہے جتنا شکل سے۔ سو بات ممی تک پہنچ گئی اور بات پکی ہو گئی۔''

میترئی نے ہنستے ہنستے دل لگی کے انداز میں جواب دیا:

''فوٹو دیکھ کر مجھے لگا کہ میں نے بھی شاید اسے کبھی دیکھا ہے۔ خیر بہت اچھا ہوا، سینئر ہونے کے ناتے تم میرے لیے بہت بڑی رکاوٹ بن گئی تھی۔ اب تو میرے لیے راستہ کھل گیا۔''

پھر دونوں نے قہقہہ لگایا۔

''معلوم ہوتا ہے کہ کچھ معاملہ ہے جس کی پردہ داری ہو رہی ہے۔ کہہ دو تو تمھاری بھی بات چلا دوں۔''

''واہ ری دیدی، نیکی اور پوچھ پوچھ۔ دراصل وہ میرا ہم جماعت ہے۔ میرے ساتھ ہی ایم ڈی کر رہا ہے۔ اس سے پہلے ایم بی بی ایس میں بھی میرا کلاس فیلو رہا۔ بڑا ہی ہینڈسم بندہ ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت قریب سے جانتے ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ پڑھائی ختم ہوتے ہی ممی سے بات کرلوں گی۔ اب تم نے شروعات کر لی ہے تو سوچ رہی ہوں کہ ایک ساتھ ہی کیوں نہ دونوں بہنیں سسرال چلی جائیں۔''

''خیال تو بہت اچھا ہے۔ تم اس کی فیملی ہسٹری بھیج دو اور اس کی تصویر بھی۔ میں ممی سے بات کرلوں گی۔ پھر جب ممی ہاں کہے گی تو تمہاری بھی منگنی ہو جائے گی اور بعد میں دونوں مل کر شادی کی تاریخ کا فیصلہ کرلیں گے۔''

''دیٹ از گریٹ۔ تم نے تو میری مشکل آسان کر دی، مجھے تو ممی سے کہنے میں ڈر لگ رہا تھا۔ سوچتی تھی کہ ممی کہے گی، پڑھائی کرنے بھیجا تھا یا اپنے لیے شوہر ڈھونڈنے۔ اب تم بیچ میں آگئی ہو تو بات بن جائے گی۔ آخر تمھاری وکالت پھر کس دن کام آئے گی۔ جب تم پوزیٹو ریسپانس دو گی اس کے بعد میں ممی سے بات کرلوں گی۔ فوٹو اور بائیوڈاٹا کل تک بھیج دوں گی۔ او کے گڈ نائٹ۔''

''گڈ نائٹ، سسٹر۔''

دوسرے روز میترئی نے اپنے بوائے فرینڈ پنکج رانا کا فوٹو اور اس کا بائیوڈاٹا بھیج دیا۔ وِدوشی نے بغیر وقت ضائع کیے اپنی ممی کو دکھایا اور اس کی منظوری چاہی۔ میترئی کے پیار کے بارے میں اس نے پہلے ہی سے ماں کو آگاہ کیا تھا اور تعارف نہ ہو کر بھی اس کی تعریفوں کے پُل باندھ دیے تھے جیسے برسوں سے اس کو جانتی ہو۔ سُچیتا تو پختہ کار عورت تھی، سمجھ گئی کہ بہن بہن کی طرف داری کرنے کے واسطے زمین آسمان کے قلابے ملا رہی ہے۔ خیر سُچیتا راٹھور کو بچوں کی بھلائی کی فکر تھی، اس لیے اس نے کوئی حیل وحجت نہیں کی اور اطمینان ہونے کے بعد

جلدی سے اپنی منظوری دے دی۔

وِدوشی سے رہا نہ گیا فوراً موبائیل پر میتری کو ویڈیو کال لگا دی اور اس کو مژدہ سنایا۔اس کے بعد اپنا موبائل ممی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ممی نے موبائل پکڑتے ہی بہت غصے سے بات کی:

''کیوں لاڈلی جی، تم خود یہ بات مجھے نہیں بتا سکتی تھی کہ ثالث کی ضرورت پڑی؟''

''ممی، ایسی کوئی بات نہیں تھی۔سوچا تھا جونہی کورس ختم ہو جائے گا، تو آپ کو بتا دوں گی۔آپ ناراض مت ہونا۔میرے لیے تو آپ ہی سب کچھ ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔مجھے لڑکا بھی پسند آیا اور اس کا نام بھی۔سب سے اچھی بات یہ ہے کہ دونوں رفیق کار ہو اور ایک دوسرے کو جانتے بھی ہو۔''

''ہاں یہ تو ہے ممی۔''

''بیٹی، ایک بات کہنا ہے۔امید ہے تم بُرا نہیں مانو گی۔''

''ارے کیا بات کر رہی ہو ممی، تمھاری بات اور میں برا مانوں! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''بیٹی، مجھے امید ہے تم نے اپنے بارے میں اس کو سب کچھ بتا دیا ہوگا اور کوئی بات چھپائی نہیں ہوگی۔شادی کوئی کھیل نہیں ہے دو روحوں کا میل ہے اور اس میں ایک دوسرے سے کوئی بات چھپانا سراسر غلط ہے۔میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ ازدواجی زندگی میں ایک دوسرے کو فریب دینا، جھوٹ بولنا، یا پھر کوئی بات چھپانا گھر کو دوزخ بنانے کے مترادف ہے۔''

''ممی آپ نے جو کہا اس پر میں نے پہلے ہی عمل کیا ہے۔میں نے اس کے سامنے اپنی زندگی کی ساری روداد بیان کی ہے۔خوش قسمتی سے وہ ان چیزوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔سچ تو یہ ہے کہ اسے آپ کو دیکھنے کے بڑا اشتیاق ہے، کئی بار بول چکا ہے۔جب آپ ملیں گی تو سمجھ جائیں گی کہ آپ کی بیٹی کا انتخاب غلط نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے۔پھر اسے اور اپنی بہن سے بات کر کے فیصلہ کر لو اور مجھے اطلاع دو۔ایک دو روز کے لیے دونوں یہاں آجاؤ تاکہ منگنی کی رسم پوری ہو سکے۔اس کے والدین کے لیے میں یہاں پر انتظام کر لوں گی۔''

''ممی اس کے پتا جی اس دنیا میں نہیں ہیں۔صرف اس کی ماتا جی ہیں اور دو چھوٹے بھائی ہیں، ہم ان کو ساتھ لے کر آئیں گے۔خود وہ تام جھام کے شوقین نہیں ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ منگنی کی رسم پر صرف دو تین قریبی رشتہ داروں کو مدعو کریں گے۔''

''ٹھیک ہے۔میں تم بہنوں کے فیصلے کا انتظار کروں گی۔او کے بائی۔''

''بائی ممی۔''

(۲۹)

مہینے بھر میں وِدوشی اور میترئی کی منگنی کی تقریب منعقد ہوئی۔پنکج رانا کی ماں، دو بھائی اور تین قریبی رشتے دار موجود تھے۔ دوسری طرف رنبیر چوہان، اس کا بھائی نما مربّی بھاسکر بھاردواج اور دو تین رفقا شامل تھے۔سادہ سی تقریب تھی، پجاری نے پوجا پاٹھ کی رسم ادا کی، پھر دونوں نے اپنی اپنی محبوبہ کو انگوٹھی پہنائی اور اس کے بعد والدین کی اشیرباد لی۔آخر میں سادہ طعامِ شب کا اہتمام کیا گیا تھا۔

تقریب کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ رنبیر چوہان کے ہمراہ اس کا فرینڈ، فلاسفر اور گائیڈ بھاسکر بھاردواج تھا۔دو دہائیوں سے زیادہ عرصہ گزر گیا تھا جب بھاسکر بھاردواج اور سُچیتا راٹھور ایک دوسرے سے روبرو ہوئے تھے۔اس کے بعد ایک دوسرے کو دیکھنا نہ کبھی بات ہوئی، صرف اِدھر اُدھر سے کوئی سُچیتا کی خبر بھاسکر کو پہنچا دیتا تھا۔اس وقت خیال آتا کہ نہ جانے کبھی ملیں گے بھی یا نہیں؟ کالج کی وہ میٹنگ کہیں ہماری آخری ملاقات تو نہ تھی؟ ایسا سوچ کر ہی بھاسکر کے بدن میں جھرجھری سی دوڑنے لگتی۔اس کے برعکس سُچیتا خیالوں میں بھاسکر کے ساتھ بِتائی ہوئی گھڑیاں یاد کرتی تھی، وہ ایک ساتھ گزرے لمحات، وہ وجود سے متعلق مکالمے اور وہ مستقبل کے لیے بنائے گئے منصوبے۔آج جب دونوں ایک دوسرے کے روبرو کھڑے تھے تو طے نہیں کر پا رہے تھے کہ کیا کریں؟ بات کرنے کی پہل کون کرے؟

ایک عجیب قسم کی پس وپیش تھی جو دونوں کوایک دوسرے سے دور رکھے ہوئے تھی۔ دل تو چاہتا تھا کہ پیش قدمی کریں مگر قدم ایک دوسرے کی جانب اٹھنے سے گھبرا رہے تھے۔

دریں اثنا رنبیر اور وِدوشی سُچیتا کے پاس آگئے اور اس کو بازو سے پکڑ کر بھاسکر کے قریب لے گئے۔ سُچیتا نے خود کو چھڑانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہی کیونکہ رنبیر اور وِدوشی نے پہلے ہی سے عزم کیا تھا کہ آج ان دو بچھڑے ہوئے دلوں کو ملا کر ہی دم لیں گے اور ان کی آپسی دوریاں مٹا دیں گے۔ پلان کامیاب رہا، سُچیتا بھاسکر کے روبرو کھڑی ہوگئی حالانکہ اس کی آنکھیں ابھی بھی جھکی ہوئی تھیں اور بھاسکر کی آنکھوں کا سامنا کرنے سے ہچکچا رہی تھیں۔ آخر کار رنبیر نے پہل کی:

"دیدی، یہ ہیں مسٹر بھاسکر بھاردواج جو میرے بڑے بھائی سمان ہیں۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں ان ہی کی بدولت ہوں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ میرا دوسرا جنم انہی کے ہاتھوں سے ہوا ہے۔ پھر وہ بھاسکر بھاردواج کی جانب مخاطب ہوا، بھائی صاحب، یہی ہے سُچیتا راٹھور جن کی مدد کرنے کے لیے آپ نے مجھے مدّتوں پہلے بھیجا تھا، اس نے تو مجھے راکھی باندھ کر اپنا بھائی بنا لیا ہے۔ سوچا کہ شاید آپ ایک دوسرے کو جانتے ہوں گے اس لیے ملاقات کرادیں۔" رنبیر کے لبوں پر شریری سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

بھاسکر نے بڑی نرمی سے سُچیتا کو مخاطب کر کے نمستے کہا اور اس کے جواب میں سُچیتا نے بھی بھاسکر کو نمستے کہہ دیا۔ پل بھر کے لیے ان کی نگاہیں اُٹھ کر آپس میں ٹکرا گئیں اور دفعتاً فرش پر بکھر گئیں۔ دھیرے دھیرے بے چینیاں اور تلخیاں مٹنے لگیں اور دونوں ایک دوسرے سے بے روک ٹوک بات چیت کرنے لگے۔ قرنوں کی دوریاں لمحوں میں مٹ گئیں۔ جیسے کبھی ایک دوسرے سے الگ ہوئے ہی نہ تھے۔ ان کو دیکھ کر ایک طرف وِدوشی اور رنبیر خوشی سے پھولے نہ سمائے اور دوسری طرف میتری اور پنکج فرطِ مسرت سے سرشار ہوئے۔

کھانا ختم ہوتے ہی پروہت سے شادی کی مہورت نکالنے کی درخواست کی گئی اور پھر طے شدہ تاریخ کو باقاعدہ دونوں کی شادی کی تقریب انجام پائی۔

شادی کیا ہوئی کہ سادگی اور کفایت شعاری کی مثال بن گئی، نہ کوئی نمود ونمائش اور نہ ہی کوئی تام جھام۔ شادی میں دونوں لڑکیوں کے سسرال والے شریک ہوئے خاص کر رنبیر کی اپاہج بہن کو وھیل چیئر پر لایا گیا۔ زیادہ لوگوں کو دعوت نہیں دی گئی تھی، صرف دونوں طرف کے قریبی رشتے دار تھے۔ کل ملا کر یہی کوئی ستر اسّی مہمان تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ مانسی موسی، آشرم کے سبھی مکینوں اور بھوانی تحریک سے جڑی کچھ نمایاں عورتوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ آشرم کے بچوں کے لیے یہ ایک نیا تجربہ تھا اور ان کو بہت مسرت ہو رہی تھی۔ گھوڑی پر چڑھے دونوں دولہے تو تشریف لائے مگر کسی ناچ گانے کے بغیر۔ فضا میں شور شرابے کے بِنا ہر طرف سادگی اور سنجیدگی کی مہر ثبت تھی۔ دولہے گھوڑی سے اتارے گئے اور سیدھے اس جگہ لے جائے گئے جہاں ان کو اپنی ہونے والی شریک حیات کے گلے میں جے مالا پہنانی تھی۔ اسی طرح دُلہنیں بھی روبرو کھڑی کر دی گئیں اور پھر انھوں نے ایک دوسرے کے گلے میں پھولوں کی وَرمالائیں پہنائیں۔ اس ایک لمحے کے لیے بھاسکر، سُچیتا اور ازدواجی بندھن میں بندھ رہی روحوں کو کب سے انتظار تھا۔ یہی روحوں کا مِلن مسرتِ کامل اور باطنی سکون کا ضامن ہوتا ہے۔ آخر کار ان چاروں کی تمنا پوری ہو گئی اور اب وہ ایک نیا گھر بسانے جا رہے تھے جہاں رہنمائی کے لیے نہ بھاسکر بھاردواج ہوگا اور نہ سُچیتا راٹھور۔ صرف وہ ہوں گے اور ان کی آرزوئیں۔ اب یہ ان پر منحصر ہوگا کہ وہ کیسے اپنے ماضی کو بھول کر ایک نئی زندگی کی شروعات کریں گے۔

شادی کی رسم ہندو ریتی رواج کے مطابق عمل میں لائی گئی۔ پوجا پاٹھ کے لیے مخصوص جگہ مختص کی گئی تھی جہاں پر پروہت نے پوجا کی سامگری سجائی تھی اور ہون کُنڈ بنایا تھا۔ دونوں جوڑے سامنے ہاتھ جوڑ کر فرمانبردار بچوں کی مانند بیٹھ گئے۔ پھر ہون کُنڈ میں لکڑیوں کے اوپر گھی اور دوسری سامگری ڈالی گئی اور ان کو آگ دکھائی گئی۔ سارا ماحول منتروں کی جاپ سے گونج اٹھا۔ جتنے بھی مہمان آئے تھے انھوں نے ایک ایک کر کے اپنے ماتھے پر ٹیکا اور بازو میں کلاوا بندھوایا۔ آخر میں دونوں جوڑوں نے اگنی کے ارد گرد سات پھیرے لگا کر قسم کھائی کہ عمر

پھر ایک دوسرے کی عزت و احترام کریں گے اور شریک حیات کی ضرورتوں کا خیال رکھیں گے۔ اس کارروائی میں تقریباً دو گھنٹے لگ گئے اور اس کے بعد سبھی مہمانوں نے ضیافت کی بڑی میز کی طرف رخ کیا۔ بہت ہی عمدہ دعوت کا انتظام کیا گیا تھا، بہت سارے پکوان تھے، بھیڑ زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے کوئی دھکّم دھکّا نہیں ہوئی۔ سبھی مہمان ہولے ہولے اپنی پلیٹیں بھرتے گئے اور پھر اپنی کرسی پر بیٹھ کر کھانے کا لطف اٹھاتے رہے۔ سُچیتا راٹھور اور اس کی رفیق کار خواتین کی بریگیڈ نے مہمانوں کی آؤ بھگت اور خاطر مُدارات میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کھانا ختم کر کے سبھی مہمانوں نے میزبان کا شکریہ ادا کیا اور پھر جانے کی اجازت مانگی۔ سارا ہال دھیرے دھیرے خالی ہوتا گیا۔ بس شادی شدہ جوڑے اور ان کے چند قریبی رشتے دار رہ گئے جنھیں دوسرے دن وہاں سے روانہ کیا گیا۔

تقریب کے اختتام پر سُچیتا بہت ہی جذباتی ہوگئی۔ وہ خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات سے روہانسی ہو رہی تھی۔ ایک جانب اسے اس بات کی خوشی تھی کہ دونوں بیٹیوں کا کیرئر تقریباً مکمل ہوگیا تھا اور اب وہ اپنا اپنا گھر بسانے جا رہی ہیں۔ دوسری جانب اسے اس بات کا دکھ ہو رہا تھا کہ اس کی دونوں پھول سی بیٹیاں اس سے جدا ہو رہی ہیں اور الگ رہنے جا رہی ہیں۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے مگر وہ چپکے سے انھیں اپنی ساڑھی کے پلّو سے صاف کرتی جا رہی تھی۔ اس دوران جب بھاسکر کی نظر سُچیتا پر پڑی تو اسے شک ہوا کہ وہ بیٹیوں کی بدائی کے غم میں آنسو بہا رہی ہے۔ وہ جلدی سے اس کے قریب آگیا اور اس کو تسلیاں دینے لگا۔

''سُچیتا، یہ تو فطرت کا قانون ہے۔ لڑکی کو ایک نہ ایک دن پرائے گھر جانا ہی پڑتا ہے۔ تم اپنے آپ کو سنبھالو اور حوصلے سے کام لو۔ تم تو دلیر اور ہمت والی عورت ہو، پھر یہ آنسو کیوں؟''

''نہیں بھاسکر، یہ خود ہی نہ جانے کیسے پھوٹ نکلے۔ شاید یہ بھی فطرت کی ہی دین ہے۔ اس حقیقت کو جان کر بھی کہ بیٹی پرایا دھن ہوتی ہے، اس کے سسرال روانہ ہونے پر والدین کی آنکھیں خود بخود بھر آتی ہیں۔ انھیں اپنی بیٹی کا بچپن، اس کا لڑکپن اور پھر اس کے

ساتھ ساجھا کیے ہوئے بہت سارے پل اس ایک موقعے پر یاد آتے ہیں۔ شاید آئندہ زندگی کی بے ثباتی کا ڈر بھی اس میں شامل ہوتا ہے۔ یہ دو بچیاں میرے بطن سے پیدا تو نہیں ہوئی تھیں مگر پھر بھی مجھے لگتا ہے کہ یہ میرے وجود کے ٹکڑے ہیں جو مجھ سے الگ ہو رہے ہیں اور اب میں پھر اکیلی رہ جاؤں گی۔ آج مجھے سمجھ آرہا ہے کہ جنم دینے والی دیوکی ماں سے زیادہ لالن پالن کرنے والی یشودھا ماں کس کرب سے گزری ہوگی۔"

"سُچیتا، تم کیوں اپنے آپ کو اکیلی سمجھ رہی ہو۔ ہم سب تمھارے ساتھ ہیں۔ میں تو ابھی زندہ ہوں، جب ضرورت پڑے گی بلا لینا۔ پھر گاؤں میں تم کو پوجنے والی اتنی ساری خواتین بھی ہیں جو تمھیں بڑی دیدی مانتی ہیں۔ تم نے ان کا جیون سنوارا ہے، وہ کیسے تم کو بھلا سکتی ہیں۔ زندگی میں یہ ضروری نہیں ہے کہ رشتے صرف خون کے ہوں، اکثر و بیشتر دوست احباب خون کے رشتوں سے زیادہ قریب ہو جاتے ہیں۔ میری التماس ہے کہ تم صبر و استقلال سے کام لو اور دوبارہ اپنی ہمت جٹا کر آگے بڑھتی جاؤ۔ ابھی ہماری منزل کوسوں دور ہے اور ہمیں آگے ہی آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ میں تم میں وہی پرانی سُچیتا دیکھنا چاہتا ہوں جو ستاروں پر کمندیں پھینکا کرتی تھی۔"

سُچیتا نے اپنی آنکھیں صاف کر لیں اور بھاسکر کی طرف نظریں اٹھا کر مسکرائی جیسے اس کا شکریہ ادا کر رہی ہو۔ کچھ لمحوں بعد دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

(۳۰)

کوشکی شادی میں شریک نہ ہو سکی کیونکہ وہ ملک سے باہر کرکٹ کھیلنے کے لیے چلی گئی تھی۔ جب سے وہ قومی ٹیم کی رکن بن گئی ہے اس کی کارکردگی بہت ہی عمدہ اور نمایاں رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا انتخاب تینوں فارمیٹس میں ہوا ہے۔ غیر معمولی صلاحیتوں کے سبب سب لوگ اس کو پسند کرتے ہیں اور اس کے فین دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے کردار کی

سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے کام سے مطلب رکھتی ہے، نہ لاف وگزاف اور نہ کوئی نمود ونمائش، نہ بڑا بول بولنا اور نہ ہی چاپلوسی کرنا۔ وہ ہردم سنجیدہ، ہنرمند، مرتکز، ٹیم کی فرد اور قابل رسائی نظر آتی ہے۔ کوشکی خود کو ہمیشہ ایک مبتدی سمجھتی ہے جس کو مزید سیکھنے اور مشق کی ضرورت ہے اور اس کی یہی انکساری اس کو دور تک لے جانے کی ضامن ہے۔ ذاتی زندگی کے شروعاتی دور میں اس کو جن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا ان کا کوشکی نے بڑی حوصلہ مندی سے مقابلہ کیا اور ظفریاب ہوئی۔ اس پر طرّہ یہ کہ حال ہی میں اس کے ستم گر باپ نے عدالت میں اس پر حق جتانے کا دعویٰ کیا تھا مگر کوشکی کی طرف سے اس کی وکیل وِدوشی کے دفاع نے کوشل ورما کو چاروں شانے چت گرا دیا اور وہ اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔ یہ ذِلّت کوشل ورما کے تابوت میں آخری کیل کا کام کر گئی۔ وہ کہیں کا نہ رہ گیا۔ اس سے پہلے ہی وہ شراب خوری، نشے، جوئے اور عشق بازی کے باعث عرش سے فرش پر گر چکا تھا حالانکہ بعد میں اس نے خود کو سنوارنے کی بہت کوششیں کی تھیں مگر سب رائیگاں ہو گئیں۔ اسی کوشش میں وہ عروس البلاد ممبئی سے پرہلاد پور واپس چلا آیا تھا اور وہاں ہوٹل کھولنے کے علاوہ سیاست میں قدم رکھنے کی کوشش کی تھی مگر اس کے ماضی کا گرہن اس کی سیاسی زندگی پر پڑا جس نے اس کو پوری طرح نگل ڈالا۔ نتیجتاً کوشل ورما میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ علاوہ ازیں اس کو شدید مالی نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ اس کے بعد اس کی نظر اپنی متروکہ بیٹی کوشکی کی دولت پر پڑی، اس کو اپنے قبضے میں لینے کے لیے عدالت میں گوہار لگائی مگر وہاں سے بھی منہ کالا کر کے آ گیا۔ بُری عادتوں کی وجہ سے اس کے قلب اور جگر کی سوزش نے شدّت اختیار کی اور انجام کار ایک روز وہ گھر میں سیڑھیاں اترتے ہوئے لڑھک گیا اور پھر کبھی آنکھ نہیں کھول پایا۔ اس وقت نہ تو کوئی اس کے آس پاس تھا اور نہ ہی کوئی بعد میں تعزیت کے لیے حاضر ہوا۔ نہ کوئی نشیڈی دوست سامنے آیا، نہ کوئی معشوقہ اور نہ ہی کوئی رشتے دار۔

ایک پڑوسی کو معلوم تھا کہ اس کی ایک بیٹی ہے جو معروف کرکٹ کھلاڑی ہے اور جس کو تحویل میں لینے کے لیے اس نے عدالت کے دروازے کھٹکھٹائے تھے، سوچا شاید باپ کی

موت کی خبر سن کر دل پسیج جائے۔ کوشکی کے ساتھ رابطہ کرنے کا ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ تھا سُچیتا، اس نے جلدی سے سُچیتا کا ٹیلی فون نمبر ڈھونڈ نکالا اور اس کو اطلاع دی۔ سُچیتا تردّد میں پڑ گئی لیکن اس نے بُردباری سے کام لیا اور ٹیلی فون کرنے والے کو ہدایت دی کہ وہ انتم سنسکار کرنے میں کوئی جلدی نہ کرے، ممکن ہے اس کی بیٹی یہ کام کرنے کے لیے جلدی پہنچ جائے۔

کچھ توقف کے بعد اس نے کوشکی کو فون ملایا۔

''ہیلو کوشکی، میں سُچیتا بول رہی ہوں۔''

''ہاں ممی کہو، کیسے فون کیا؟''

''بیٹی ایک بری خبر ہے۔''

''کیا ہے، بتاؤ تو سہی۔''

''تمھارے پِتا جی کا دیہانت ہو گیا ہے اور مجھے کسی نے وہاں سے فون پر اطلاع دی۔ میں چاہتی ہوں کہ تم یہاں آ کر اس کا انتم سنسکار کر لو۔''

''ممی، کس کا پِتا جی، کون پِتا جی؟ میں تو کسی پِتا جی وِتا جی کو نہیں جانتی۔''

''کوشکی، بیٹی اس وقت یہ زیب نہیں دیتا۔ آخر اس نے تمھیں جنم دیا ہے۔''

''ممی، یہ ممکن نہیں ہے۔ میں اس آدمی سے بے حد نفرت کرتی ہوں۔ میں اس کا انتم سنسکار کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔''

''بیٹی، تمھیں معلوم ہے کہ میں تم لوگوں کا کبھی برا نہیں چاہتی۔ میں نے کبھی کسی کو غلط راستہ نہیں دکھایا ہے۔ میری مخلص رائے تو یہی ہے کہ تم پرانی باتوں کو بھول جاؤ اور اپنے پِتا جی کو اپنے ہاتھوں سے داہ سنسکار کر لو۔ اسی میں بڑاپن ہے۔ میں تمھارے دکھ کو سمجھتی ہوں، میرا دکھ تم سے کچھ کم نہیں ہے مگر بیٹی خون کے رشتے کو ٹھکرانا اچھی بات نہیں ہے۔ اب تو وہ مر چکا ہے اور تم سے کوئی امید نہیں رکھتا ہے پھر تمھیں یہ کام کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیے۔''

''ممی، میرا دل نہیں مانتا ہے۔''

''بیٹی میں نے کبھی تمھیں غلط مشورہ نہیں دیا ہے۔ میری بات مان لو اور ہوائی جہاز سے

آ کر اپنے پِتا جی کا انتم سنسکار کر لو، اسی میں تیری بھلائی ہے۔ اس وقت ہو سکتا ہے کہ تمھیں میری صلاح بری لگے مگر بعد میں تم سمجھ جاؤ گی کہ انکار کرنے سے تم یہ واحد موقع کھو جاتی۔ پھر یہ احساسِ گناہ تمھیں عمر بھر کچوکتا رہے گا۔"

"ٹھیک ہے ممی جیسا تم چاہتی ہو۔ تمھیں کیسے انکار کر سکتی ہوں۔ میں ابھی سانتا کروز ائیر پورٹ جا کر ہوائی جہاز سے آ جاؤں گی اور ائیر پورٹ سے سیدھے ٹیکسی لے کر پرہلاد پور پہنچ جاؤں گی۔"

"یہ رہی ناں بات میری پیاری بچّی۔ میں ابھی انھیں مطلع کروں گی کہ تم آ رہی ہو اور لاش کو تب تک شمشان گھاٹ نہیں لے جانا۔"

سُچیتا راٹھور نے اس آدمی کو جس نے پرہلاد پور سے ٹیلی فون کیا تھا فوراً خبر دی کہ کوشل ورما کی بیٹی آ رہی ہے اور شام تک پہنچ جائے گی۔ اس کا انتم سنسکار کل صبح ہوگا اور وہ خود ہی کرے گی کیونکہ یہ بیٹی کا فرض بنتا ہے۔

کوشِکی ٹیکسی میں رات کے آٹھ بجے پرہلاد پور پہنچ گئی اور پوچھ پاچھ کر اپنا گھر ڈھونڈ لیا۔ وہاں برف کی سِل پر لاش رکھی ہوئی تھی اور سب اس کا انتظار کر رہے تھے۔ بہت روکنے کے باوجود کوشِکی کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ وہ سوچنے لگی کہ کاش میرا باپ ایسا نہ ہوتا تو آج میں اس کے ساتھ ہوتی اور ممکن ہے کہ نہ میری ماں مر جاتی اور نہ ہی میرا باپ۔ رات یوں ہی جاگتے ہوئے بیت گئی اور صبح دم کوشل ورما کی لاش کو شمشان گھاٹ لے جایا گیا۔ بیٹا تو تھا نہیں اس لیے کریا کرم بیٹی نے کیا اور پھر کوشل ورما کا جسم پانچ تتوں میں منقسم ہو کر بکھر گیا۔

(۳۱)

کورٹ کیس کے دوران وِدوشی کو اپنی ماں کی تاریخِ پیدائش معلوم ہو گئی جو اس نے نوٹ کر لی ورنہ سُچیتا کہاں اور جنم دن کہاں۔ اس نے تو یہ موج مستی کب کی چھوڑ دی تھی۔ وِدوشی

اور اس کے شوہر رنبیر چوہان نے طے کیا کہ ماں کو خبر کیے بِنا ہی اس کے برتھ ڈے کا انتظام کرائیں گے اور اسے وہاں لا کر سرپرائز دیں گے۔ انھوں نے میترئی اور اس کے شوہر پنکج رانا کو بھی اعتماد میں لیا اور نزدیک ہی ایک ہوٹل میں سالگرہ کی تقریب منانے کا انتظام کرایا۔ رنبیر اور پنکج نے سجاوٹ و آرائش اور وِدوشی اور میترئی نے مہمان نوازی و خاطر مدارات کا ذمہ لے لیا۔ کسی اور کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی جب تک کہ سُچیتا راٹھور کو وہاں پہنچایا گیا۔ اس کے ساتھ مانسی موسی بھی تھی جو اب بہت بوڑھی ہو چلی تھی۔ سُچیتا کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور کس لیے ہو رہا ہے۔ اتنی دیر میں بھاسکر بھاردواج اور کچھ اور قریبی رشتے دار بھی ہال میں وارد ہو گئے۔

ہوٹل کے بیرے نے کچھ دیر بعد ٹیبل پر رکھے ہوئے ایک بڑے کیک پر سے پردہ ہٹا دیا۔ وِدوشی نے آگے بڑھ کر اپنی ماں کو کیک کاٹنے کی درخواست کی۔ سُچیتا حیران ہوئی کہ آج اتنے سالوں کے بعد کس کو میرے جنم دن کی یاد آ گئی۔ پہلے تو بھاسکر پر شک کرنے لگی مگر پھر وِدوشی نے راز فاش کیا کہ انھیں ماں کے جنم دن کا پتا کورٹ کیس کے ذریعے چل گیا۔ وہ چُپ چاپ آگے میز کی جانب بڑھ گئی، اِدھر اُدھر دیکھ لیا اور بھاسکر کو وہاں پا کر بہت خوش ہوئی۔ اتنی دیر میں سب مہمان میز کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ وِدوشی نے جلدی سے اپنی ماں کے ہاتھ میں پلاسٹک کا چاقو تھما دیا اور سُچیتا نے آرام سے کیک کاٹ لیا۔ ہر طرف سے 'ہپی برتھ ڈے ٹو یوٗ' کے نعرے بلند ہو گئے۔ پھر وِدوشی کو ترچھی آنکھوں سے دیکھ کر مسکرائی جیسے کہہ رہی ہو کہ اس ساری کارستانی کے پیچھے صرف تم ہو۔ دریں اثنا بھاسکر نے آگے بڑھ کر کیک کا ایک پیس سیدھے ہاتھ کے انگوٹھے اور انگلی سے اٹھا لیا اور سُچیتا کے منہ میں ٹھوس لیا۔ سبھی مہمانوں نے زور زور سے تالیاں بجائی اور دوبارہ 'ہپی برتھ ڈے ٹو یوٗ' کے نعرے ہال میں گونجے۔ اس کے بعد پارٹی میں کچھ دھوم دھڑاکا ہونے لگا۔ یوں تو شروع ہی سے وہاں پر ڈی جے اپنے کرتب دکھا رہا تھا اور پسندیدہ فلمی ریکارڈ بجا رہا تھا مگر اب کچھ مہمانوں نے بھی اپنے اپنے ہنر کا نمونہ پیش کیا۔ ڈی جے نے ایک ایک کر کے ان کا تعارف کرایا اور پھر انھوں نے یا تو گانا گایا یا کچھ

چٹکلے سنا کر سبھی کو ہنسایا۔ بھاسکر نے بھی موقع غنیمت جان کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی اور ایک درد بھرا فلمی گیت گایا۔

پاس آئے دوریاں پھر بھی کم نہ ہوئیں
اِک ادھوری سی ہماری کہانی رہی
آسماں کو زمیں، یہ ضروری نہیں، جان لے جان لے
عشق سچا وہی جس کو ملتی نہیں منزلیں منزلیں
رنگ تھے، نور تھا جب قریب تو تھا
اِک جنت سا تھا یہ جہاں
وقت کی ریت پے کچھ میرے نام سا
لکھ کے چھوڑ گیا تو کہاں
ہماری ادھوری کہانی، ہماری ادھوری کہانی
ہماری ادھوری کہانی، ہماری ادھوری کہانی....

گیت گاتے گاتے بھاسکر کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ اُدھر سُچیتا کی آنکھوں میں بھی آنسو مچلنے لگے۔ اس نے انھیں روکنے کی بہت کوشش کی اور جب رہا نہ گیا تو چپ چاپ واش روم میں چلی گئی۔ وہاں اس نے اپنی آنکھوں کو صاف کیا اور پھر پرس میں سے کچھ میک اَپ کا سامان نکال کر اپنا چہرہ درست کیا۔

سُچیتا اور بھاسکر کی دُردشا دیکھ کر وِدوشی اور میترئی دونوں تردّد میں پڑ گئیں۔ آپس میں سوچ بچار کے بعد دونوں نے فیصلہ کیا کہ ان دونوں آتماؤں کو ملا کر ہی دم لیں گے۔

گانا بجانا جب ختم ہوا تو طعامِ شب تیار ہونے کا اعلان کیا گیا۔ سبزی خوروں کے لیے ایک میز پر مختلف پکوان سجائے گئے تھے جبکہ گوشت خوروں کے لیے الگ ایک میز پر مٹن اور چکن کی مختلف قسمیں قطار میں لگائی گئی تھیں۔ ڈائننگ ہال ضیافت کی خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ مہمان اندر آتے ہی کھانے پر ٹوٹ پڑے اور ہر طرف چمچوں اور پلیٹوں کی کھنک سنائی

دینے لگی ۔اس بے ہنگم آواز کے ساتھ مہمانوں کی گفتگو کا بھی شور سنائی دے رہا تھا۔ وہ دوستوں ورشتے داروں سے اپنے تجربات کا تبادلہ کر رہے تھے۔ ڈنر کے بعد سبھی مہمان کافی سے محظوظ ہوئے۔

دعوت کے اختتام پر سبھی مہمانوں نے میزبانوں کا شکریہ ادا کیا اور پھر اپنی اپنی راہ لی۔

(۳۲)

گھر پہنچ کر وِدوشی اور میترئی اپنے مشن پر لگ گئیں۔ دونوں نے اپنے اپنے شوہر سے اس بارے میں مشورہ کیا اور اچھا سا منصوبہ بنانے کی درخواست کی۔ پنکج نے، جو اس فیملی کو زیادہ قریب سے نہیں جانتا تھا، میترئی سے پوچھ لیا۔

''پہلے یہ تو بتاؤ کہ ان دونوں کی عمر کتنی ہے؟ کیونکہ ایسا منصوبہ تبھی بنایا جا سکتا ہے جب ان کی عمر بہت زیادہ مانع نہ ہو اور وہ ہماری تجویز پر غور کر سکیں۔''

میترئی نے جواب دیا۔ ''ممی کی عمر تو مجھے معلوم ہے، وہ سینتالیس برس کی ہے۔ چنانچہ دونوں ہم جماعت تھے عمر میں زیادہ فرق نہیں ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ بھاسکر کی عمر ایک دو سال زیادہ ہو۔''

''پھر تو کوئی پرابلم نہیں ہونی چاہیے۔ یہ معاملہ ذرا پیچیدہ ہے اس لیے ہمیں پھونک پھونک کر قدم اٹھانا پڑے گا تاکہ کیے کرائے پر پانی نہ پھر جائے۔''

''ہاں آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ ہم سب دو تین روز میں سوچ کر پھر اس بات پر اکٹھے غور کریں گے۔'' میترئی نے جواب دیا۔

چار روز کے بعد اس مسئلے پر دوبارہ میٹنگ ہوئی اور یہ طے پایا کہ چونکہ رنبیر بھاسکر کا دایاں بازو ہے اس لیے وہ اور وِدوشی بھاسکر بھاردواج کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کریں گے۔ رہی بات سُچیتا کی، اس کو میترئی اور پنکج اپنے قابو میں کرنے کی کوشش کریں گے۔

سُچیتا راٹھور اور بھاسکر بھاردواج دونوں اپنی اپنی جگہ خود روزگار کی علامتیں بن چکے ہیں۔ دونوں نے نہ صرف آزاد پیشہ اختیار کیا بلکہ دوسروں کے لیے بھی روزگار کے مواقع فراہم کیے۔ بھاسکر نے نجی کمپنیاں کھول کر اپنی صلاحیتوں سے بھرپور کام لیا اور آج اس کی کمپنیاں سیکڑوں کروڑ کا بزنس کرتی ہیں۔ شروعات تو دست کاریوں کی برآمد سے کی لیکن بعد میں بھاسکر نے دھاگہ اور کپڑا تیار کرنے کے کئی کارخانے لگائے اور پھر ان ملوں سے نکلے کپڑے سے ریڈی میڈ کپڑے بنوائے جن کی خردہ فروشی کا انتظام چند بڑے شہروں میں مخصوص شوروم کھول کر کیا۔ جب ملک میں کمپیوٹر سوفٹ وئیر کا ریلا آ گیا تو اس نے بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لیے۔ نتیجے میں اس کی کمپنیوں کا کاروبار حال ہی میں پانچ سو کروڑ پار کر گیا۔ اس دوران اس نے سیکڑوں ہنر مند اور غیر ہنر مند مزدوروں کو روزگار مہیا کیا جس کی وجہ سے وہ انتہائی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ گو اس کو اپنی صلاحیتوں پر پورا بھروسہ تھا مگر اتنے تھوڑے سے عرصے میں اتنا سب کچھ پالینا اس کے گماں میں بھی نہ تھا۔ اس میں اس کے ماں باپ کی اَشیر باد بھی شامل تھی اور سُچیتا کی دعائیں بھی۔ مگر ایک بات جو وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے بھاسکر کے قدم ایک لحظہ کے لیے بھی نہیں ڈگمگائے اور وہ زمینی حقیقت سے ہمیشہ جڑا رہا۔

اِدھر سُچیتا بھی کسی سے کم نہ تھی۔ اس نے بھی اپنا سارا وجود سماج سیوا کے لیے وقف کیا تھا۔ اس نے نہ صرف خود روزگار کا منشا سمجھ لیا تھا بلکہ دوسروں کو بھی سمجھایا تھا۔ سُچیتا نے سارے علاقے میں عورتوں کو روزگار فراہم کرنے کے لیے جو تحریک چلائی تھی وہ بے حد کامیاب رہی اور اس کا پھل چند ہی برسوں میں مل گیا۔ اس کی جد وجہد کے باعث کئی بچوں کا بچپن برباد ہونے سے بچ گیا، کئی لڑکیوں کو تعلیم سے آراستہ کیا گیا، کئی طلبہ تعلیم سے منوّر ہو کر پیشہ وروں کی صف میں کھڑے ہو گئے اور کئی غریب و بیوہ عورتوں کو خود مکتفی بنایا گیا، ان سب کا شمار کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ بھوانی پور کے ارد گرد پھیلی خوشحالی اور ترقی سب اس پُر اعتماد عورت کی دین ہے۔

ناکام عشق سے ملی تحریک کو صحیح راستے پر ڈالا جائے تو معجزات وجود میں آتے ہیں۔ ساری دنیا کے لیے یہ معجزے یادگار بن جاتے ہیں۔ وَردان اَناتھ آشرم، وَردان سیکنڈری

اسکول، بھوانی کواپریٹو اور خود بھوانی پور گاؤں ان ہی معجزوں کی زندہ جاوید مثالیں ہیں۔
منصوبے کے مطابق وِدوشی اور رنبیر نے بھاسکر کو اپنے یہاں بریک فاسٹ پر مدعو کیا۔ ان کو معلوم تھا کہ بھاسکر کو جنوبی ناشتے جیسے ڈوسا، اِڈلی، میدھو وَڈا اور سامبر اچھے لگتے ہیں اس لیے ناشتے کی میز پر یہی کچھ سجایا گیا۔ بھاسکر ناشتہ دیکھ کر حیران ہوا اور تجسس کے باعث پوچھ بیٹھا کہ یہ کس نے بنایا ہے؟ وِدوشی نے مسکرا کر جواب دیا کہ ہم دونوں نے مل کر بنایا ہے۔ بھاسکر چٹخارے لے کر ناشتہ کرنے لگا اور اس دوران رنبیر نے بات چھیڑ دی۔
''بھائی صاحب، آپ نے میری زندگی سنوارنے میں کیا کچھ نہیں کیا۔ میں تو کئی جنموں تک آپ کا قرضہ نہیں چُکا پاؤں گا۔ اب میں نے سوچا ہے کہ میں بھی کچھ آپ کے لیے کروں۔ اگر آپ کو بُرا لگے تو مجھے معاف کرنا۔ وِدوشی اور میں چاہتے ہیں کہ آپ اور سُچیتا جی ایک دوسرے کے جیون ساتھی بن جائیں۔''
بھاسکر بھاردواج رنبیر کی بات سن کر بھونچکا رہ گیا۔ اس نے اس بارے میں کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ جب سے دونوں بچھڑے تھے تب سے ایک دوسرے کو من ہی من میں چاہتے تھے مگر ایسے بندھن کے بارے میں کبھی تصور بھی نہیں کیا۔ وہ ابھی تردّد ہی میں تھا کہ وِدوشی بول اٹھی۔ ''ہاں انکل، میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ماضی میں جو ہوا سو ہوا، ہمیں اس کو بھول جانا چاہیے۔ اب تو آپ دونوں کے بیچ میں کوئی رُکاوٹ نہیں ہے۔ دونوں آزاد ہیں اپنے بارے میں فیصلہ لینے کے لیے۔ جس چیز کو عمر بھر چاہا ہے اس کو پا لینے سے کتنی فرحت اور خوشی محسوس ہوگی، وہ میں ہی سمجھ سکتی ہوں۔ انکل، آپ ہماری یہ چھوٹی سی تجویز پر غور کریں، ہمیں لگتا ہے کہ اسی میں آپ دونوں کی بھلائی ہے۔''
''بھائی صاحب، آپ دونوں کے خیالات ملتے جلتے ہیں۔ آپ اور سُچیتا جی کو ایک دوسرے کے طور طریقوں سے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ اس کے سنگ آپ اپنی زندگی کا مقصد پا سکتے ہیں اور میں تو یقیناً کہہ سکتا ہوں کہ وہ آپ کی مددگار ثابت ہوگی۔ پھر آپ بھی تو اس کے کام سے بے حد مطمئن ہیں اور اس کی تعریف کرتے رہتے ہیں، ممکن ہے کہ آپ کے ساتھ مل

کر وہ بہتر خدمت خلق کے کام کر سکے گی۔ مجھے بھروسہ ہے کہ آپ اس ناچیز کی التجا کو نہیں ٹھکرائیں گے۔ ہاں آپ کی طرف سے ہری جھنڈی دکھائی دے تو ہم سُچیتا جی سے بھی بات کرلیں گے اور اس کو قائل کرنے کی کوشش کرلیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے بھائی کی تجویز نہیں ٹھکرائے گی۔"

"رنبیر، میں نے اس بارے میں نہ کبھی سوچا ہے اور نہ کبھی دھیان دیا ہے۔ تم لوگوں نے مجھے عجیب سی الجھن میں ڈال دیا ہے۔ یہ دو زندگیوں کا سوال ہے اور اس پر سوچنے کے لیے کچھ وقت درکار ہے۔ میں دو چار دن میں آپ لوگوں کو اپنے فیصلے سے مطلع کرلوں گا۔"

بھاسکر نے ناشتہ ختم کرلیا اور واش روم میں جاکر اپنے ہاتھ دھولیے۔ اس کے بعد اجازت لے کر وہ اپنے گھر چلا گیا۔ راستہ بھر وہ اسی فکر و سوچ میں غرق رہا۔

(۳۳)

اُدھر میترئی اور پنکج رانا بھی اپنی مہم پر لگ گیے۔ دونوں نے اپنی تعلیم مکمل کرلی تھی اور نزدیک ہی شہر کے ایک بڑے اسپتال میں ملازمت اختیار کرلی تھی۔ پنکج نے اپنی ماں اور بھائی کو بھی اپنے پاس بلایا تھا۔ اتوار کے دن دونوں کی چھٹی رہتی ہے اس لیے سُچیتا راٹھور کو اپنے یہاں سنیچر کو ڈنر کے لیے بلالیا تاکہ وہ رات بھر وہاں رہ کر دوسرے روز آرام سے واپس اپنے گھر چلی جائے۔ سُچیتا کو کسی بات کی بھنک بھی نہیں پڑی اور وہ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اپنی بیٹی کے گھر چلی گئی۔ بیٹی کا گھر تھا اس لیے راستے میں کافی ساری مٹھائیاں خرید کر گفٹ پیکنگ کروادی۔ پہنچتے ہی اس نے میترئی کی ساس کے ہاتھ میں مٹھائیوں کے ڈبے رکھ دیے۔ میترئی اور پنکج نے آگے بڑھ کر اس کے چرن چھولیے اور اس کی آشیرباد لے لی۔ پھر میترئی اپنی ممی کو ڈرائنگ روم کے صوفے پر بٹھانے کے لیے لے گئی۔

سُچیتا کے لبوں پر یک گونہ مسکراہٹ تھی۔ کیوں نہ ہوتی، ایک ماں جب اپنے بچوں کو

کامیاب ہوتے دیکھتی ہے تو خوشی سے باغ باغ ہو جاتی ہے۔ سامنے پنکج اور میترئی کے علاوہ اس کی ساس اور دیور بھی آ کر بیٹھ گئے۔ ماحول بہت ہی خوشگوار لگ رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد میترئی نے اپنی ماں کو اپنے کپڑے پہننے کے لیے دے دیے اور واش روم میں ہاتھ منہ دھونے کے لیے بھی کہا تاکہ وہ آرام سے بیٹھ سکے۔ اس نے یہ بھی اصرار کیا کہ آج رات وہ ان کے ساتھ ہی رہے گی اور کل صبح پنکج اس کو اپنی کار میں واپس چھوڑ دے گا۔ سُچیتا نے دل میں سوچا کہ کیا اس کی بیٹی اتنی بڑی ہوگئی ہے کہ اب وہ مجھے بتانے لگی ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ زیر لب ہنسی بھی آ گئی اور اپنی بیٹی پر فخر بھی محسوس کیا۔ خیر اس نے ویسا ہی کیا جیسا کہ اس کی بیٹی نے کہا اور پھر واپس آ کر صوفے پر آرام سے براجمان ہوگئی۔

طعامِ شب بڑا لذیذ تھا، میترئی کی ساس نے خود ہی اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ اس کے اس ہنر سے اس کا بیٹا اور بہو خوب واقف تھے جبکہ میترئی کو چائے بنانے کے سوا کچھ بھی نہیں آتا تھا۔ وہ شادی کے بعد اپنی ساس سے کھانا بنانا سیکھنے لگی تھی۔ پنکج بھی اس کی طرح اناڑی تھا۔ کھانا کھانے کے بعد سُچیتا اپنی انگلیاں چاٹتی رہ گئی۔ مدتوں بعد اس نے گھر میں بنا ہوا ذائقہ دار کھانا تناول فرمایا تھا۔ وہ تعریفوں کے پُل باندھتی رہ گئی۔ میترئی نے رس گُلے بھی بطور سویٹ ڈِش بازار سے منگوائے تھے کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ ماں کو رس گُلے بہت پسند ہیں۔

پنکج نے اپنی ماں اور بھائی کو اپنے منصوبے کے بارے میں پہلے ہی گوش گزار کیا تھا اس لیے دونوں کھانا کھانے کے فوراً بعد اپنے کمرے میں چلے گئے اور ڈرائنگ روم میں صرف میترئی، پنکج اور سُچیتا رہ گئے۔

میترئی نے گفتگو کا آغاز کیا۔ ”ممی، کیسے چل رہا ہے آپ کا کام آج کل؟“

”بس، معمول کی طرح۔ کیوں کچھ فرق محسوس ہو رہا ہے تم کو؟“

”نہیں ممی، آپ کی لگن کو دیکھ کر میں اور پنکج دونوں حیران ہیں۔ بھگوان آپ کو لمبی عمر دے اور آپ ایسے ہی لوگوں کی خدمت کرتے رہیں۔“

”تھینکس ڈیئر۔ میرے لیے تو زندگی میں یہی ایک مشن ہے۔ جب تک ہاتھ پاؤں

چلتے رہیں گے تب تک کرتی رہوں گی، پھر اس کے آگے بھگوان جانے۔''

''اوہ...اتفاق سے مجھے یاد آیا کہ آپ جنم دن کی پارٹی میں بھاسکر صاحب کا گانا سن کر اتنی جذباتی کیوں ہوئی تھیں؟ آنکھوں میں آنسو اور پھر انھیں صاف کرنے کے لیے آپ واش روم کی جانب دوڑی چلی گئیں۔ کچھ تو بات تھی ممی۔ اُدھر بھاسکر کی آنکھیں بھی نم تھیں۔''

سُچیتا کچھ جواب نہیں دے پائی۔ البتہ پنکج رانا بیچ میں بول اٹھا۔

''لگتا ہے دونوں ایک دوسرے کو ابھی تک بھول نہیں پائے ہیں۔ میں نے تو سنا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو بے حد پیار کرتے تھے۔ بُرا ہو اس سماج کا جو دو دلوں کے درمیان دیواریں کھڑی کر دیتا ہے۔''

''سچّی ممی، میں بھی اس روز آپ کو دیکھ کر بہت اندوہ گیں محسوس کر رہی تھی۔ آپ اتنے برسوں کے بعد بھی بھاسکر کو نہیں بھول پائے ہیں۔''

سُچیتا نے ہمت جٹا کر جواب دیا۔ ''بیٹی، یہ سب قسمت کا کھیل ہے۔ انسان اس میں کچھ نہیں کر سکتا۔ کاتبِ تقدیر نے جو لکھا ہوتا ہے وہی ہو کر رہتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے بے حد پیار کرتے تھے اور ایک ساتھ زندگی گزارنے کا ارادہ کر چکے تھے مگر میرے والدین قدامت پرست تھے، انھیں یہ رشتہ منظور نہ تھا اور انھوں نے مجھے کسی اور کی جھولی میں ڈالنا چاہا۔ لیکن قسمت نے وہاں بھی اپنا کھیل کھیلا اور اس آدمی نے طے شدہ جہیز بر وقت نہ ملنے پر دروازے ہی سے برات واپس لے لی۔ اس کے بعد میں نے پھر کبھی شادی نہ کرنے کی ٹھان لی۔ اچانک میری زندگی نے نئی کروٹ لی اور میں وہ سب کر پائی جو میں نے کیا۔ میں اس کامیابی سے بہت مطمئن ہوں۔ پھر بھی بیٹی دل سے یادیں مٹانا مشکل ہوتا ہے۔ جب کبھی کوئی گانا دل کے تار چھیڑ دیتا ہے تو آنسو خود بخود چھلک جاتے ہیں۔''

پنکج رانا سُچیتا راٹھور سے مخاطب ہوا۔ ''آنٹی، میں نے آپ کا جتنا بھی تھوڑا بہت مشاہدہ کیا ہے یہی نتیجہ نکل آیا کہ آپ پریم، ممتا اور ایثاریت کی مورت ہیں۔ آپ نے جو کچھ بھی کیا کوئی اور نہیں کر سکتا ہے، یہ میرا ماننا ہے۔ مگر آنٹی وقت بدلتا رہتا ہے، نئے امکانات دستک

دیتے رہتے ہیں اور ہمیں وقت کے ساتھ بدلنا چاہیے۔ میرے خیال میں آپ دونوں نے خواہ مخواہ خود پر تنہائی مسلط کی ہے۔ آپ نے اس جدوجہد میں بہت کچھ کھویا ہے۔ اگر آپ ہم دونوں کی صلاح مان لیں تو ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے، آپ اور بھاسکر کی عمر ابھی ڈھل نہیں چکی ہے، آپ دونوں اس لائق ہیں کہ آپس میں ازدواجی بندھن میں بندھ سکتے ہیں اور ایک دوسرے کا سہارا بن سکتے ہیں۔ تلخ حقیقت یہ ہے کہ موقع دوبار دستک نہیں دیتا اور بقول ملٹن برلے ''اگر موقع دستک نہیں دیتا تو دروازہ بناؤ۔'' مغرب میں تو لوگ بڑھاپے میں بھی شادی کر لیتے ہیں پھر آپ نے تو ابھی بڑھاپے میں قدم بھی نہیں رکھا ہے۔''

بچوں کے فکر انگیز بول سن کر سُچیتا کے چہرے پر مسکراہٹ اور حیرت کے ملے جُلے آثار ابھر آئے۔ اس کی نظریں دونوں کے درمیان جھول گئیں۔ وہ گویا ہوئی۔

''پنکج جی، آپ کو معلوم ہے میری عمر کتنی ہے؟ میں سینتالیس سال مکمل کر چکی ہوں۔ لوگ ہماری شادی کی بات سن کر ہم پر ہنسیں گے۔''

اس بیچ میترئی بول اٹھی۔ ''ممی، ایسا خیال آپ کے ذہنی بلاک کا نتیجہ ہے۔ لوگ پل بھر میں بہت کچھ بھول جاتے ہیں۔ وہ زندگی کی کشمکش سے اتنے دباؤ میں رہتے ہیں کہ دوسروں کے بارے میں سوچنے کی فرصت بھی نہیں ملتی۔ ہوسکتا ہے دو چار لوگ جو آپ کو قریب سے جانتے ہوں اس معاملے میں اپنی مثبت یا منفی رائے دیں مگر پھر سب اپنا اپنا راستہ ناپ لیں گے اور ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائیں گے۔ اس کے بعد رہیں گے صرف آپ، بھاسکر انکل اور ہم جو آپ کی زندگی سے جڑے ہوئے ہیں۔''

پنکج رانا کہنے لگا۔ ''آنٹی، یہ ہماری پُر خلوص تجویز ہے۔ آپ اس پر ٹھنڈے دل سے غور کیجیے۔ ہم آپ کی رائے جاننا چاہتے ہیں تاکہ بھاسکر انکل سے بھی اس بارے میں بات کر لیں۔ ہمیں اس سے بڑھ کر اور کوئی بہتر راستہ نظر نہیں آتا۔''

''ہاں ممی، میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ ہم آپ دونوں کو گھر بساتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ اب جتنی بھی زندگی بچی ہے، اس میں آپ دونوں ایک ساتھ رہیں اور خوش و خرم رہیں یہی

ہماری دِلی خواہش ہے۔''

سُچیتا راٹھور خاموش رہی اور کچھ بھی نہ بولی۔ اس نے نہ ہاں کہا اور نہ ناں۔ مگر پنکج اور میتر ئی کو سمجھ آیا کہ خاموشی ہی نیم رضا مندی ہے۔ اس لیے وہ سُچیتا کو اپنی کار میں بٹھا کر پان کی دُکان پر چلے گئے جہاں سے انھوں نے اپنی پسند کے مطابق پان خریدے اور دو پان کی گلوریاں گھر بھی لائیں تا کہ پنکج کی ماں اور بھائی کو دے دیں۔

اُدھر بھاسکر نے بھی چند روز کے بعد اپنی رضا مندی ظاہر کی۔ اس طرح راستہ صاف ہو گیا اور اب کوئی رکاوٹ نظر نہیں آ رہی تھی۔

(۳۴)

کچھ روز بعد دونوں بیٹیاں بھاسکر اور سُچیتا کو دو پہر سے پہلے ایک خوبصورت ہوٹل میں لے گئیں جہاں پہلے ہی سے خوب سجاوٹ کی گئی تھی۔ دونوں شرمیلے جوڑے کی طرح ایک دوسرے کے قریب آ گئے اور ہیلو کہہ دیا۔ پھر لبوں پر مسکراہٹ پھیلا کر ایک دوسرے کا استقبال کر لیا۔ ہوٹل میں بہت زیادہ پیمانے پر انتظام نہیں کیا گیا تھا کیونکہ دونوں کو تام جھام سے نفرت ہے۔ ہاں ایک سرپرائز دیکھنے کو ملی وہ تھی مانسی موسی۔ گھٹنوں کی تکلیف کے سبب اس کو وھیل چیئر پر لایا گیا تھا تا کہ وہ اس تقریب میں شامل ہو سکے۔ یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ کر موسی کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اس نے بھاسکر اور سُچیتا کو اپنے پاس بُلا کر ان کے ماتھے چوم لیے اور آئندہ خوشیوں سے زندگی بھرپور ہو، اس کی دعائیں دیں۔

وِدوشی نے جلدی سے اپنے پرس سے ایک ڈبہ نکال کر بھاسکر کے سامنے پیش کیا جبکہ دوسری جانب میترئی نے اپنے پرس سے ایک چھوٹا سا ڈبہ برآمد کیا اور سُچیتا کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بھاسکر بھاردواج نے جونہی ڈبہ کھولا تو وہاں ہیروں سے بھری ہوئی خیرہ کن انگوٹھی تھی جو اس نے اپنی معشوقہ کی بائیں ہاتھ کی انگشت میں پہنائی۔ ساتھ ہی ایک پھولوں کی مالا بھی اس

کے گلے میں ڈال دی۔ دوسری جانب سُچیتا راٹھور نے ڈبے سے ایک سونے کی بھاری انگوٹھی نکالی جس پر انگریزی کا لفظ 'بی' نقش کیا ہوا تھا اور اسے بھاسکر کی انگلی میں پہنا دیا۔ اس نے بھی پھولوں کی مالا بھاسکر کے گلے میں ڈال دی۔ ہال میں گنے چُنے ہی لوگ تھے اور انھوں نے جم کر تالیاں بجائیں۔

کوشکی بھی ممبئی سے آئی ہوئی تھی اور تقریب میں شامل تھی۔ اس نے اپنی جانب سے ایک خوبصورت ہیرے جڑا ہوا سونے کا ہار سُچیتا کو بھینٹ کیا اور بھاسکر کو کلائی پر باندھنے والی بہت ہی خوبصورت گھڑی تحفے میں دی۔ وہ خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھی کہ اس کی سرپرست آج نئی زندگی شروع کرنے والی ہے۔ علاوہ ازیں اسے اس بات کی بھی خوشی تھی کہ ایک روز پہلے اسے بی سی سی آئی نے 'وومن کرکٹر آف دی ائیر' کا خطاب دیا تھا اور گذشتہ سال کے دوران اس کی کارکردگی پر بہترین کھلاڑی کے تمغے سے نوازا تھا۔ اس نے یہ مژدہ سب سے پہلے سُچیتا اور بھاسکر کو سنایا جس کے بعد پارٹی میں شامل سبھی مہمانوں کو خبر ہوگئی۔ انجام کار سب طرف سے اس کو بھی بدھائیاں ملنے لگیں۔

ہوٹل میں دوپہر کے کھانے کا بھی انتظام کیا گیا تھا جسے لطف اندوز ہو کر سب لوگ اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو گئے۔ بھاسکر اور سُچیتا کو یہ سب کچھ ایک خواب سا لگ رہا تھا، وہ ایک دوسرے کی جانب حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے رہے اور آنکھوں آنکھوں میں پوچھتے رہے کہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے، وہ حقیقت ہے یا کوئی خواب ہے۔

دونوں کو ہوٹل سے سیدھے عدالت میں لے جایا گیا جہاں پہلے ہی سے اپوائنٹ منٹ لی گئی تھی۔ شادی باضابطہ طور پر عدالت میں رجسٹر ہوئی۔ متعلقہ جج کے سامنے بھاسکر اور سُچیتا نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ وہاں تصدیق کرنے کے لیے دو کے بدلے چار گواہ موجود تھے۔ سچیتا کی دونوں بیٹیاں اور ان کے شریک حیات۔ رجسٹر پر بھاسکر اور سُچیتا نے اپنے دستخط ثبت کیے اور پھر دونوں بیٹیوں نے بطور گواہ اپنے دستخط کر دیے۔ جج سمیت سبھی نے بھاسکر اور سُچیتا کو باقاعدہ طور پر شوہر اور بیوی بننے پر مبارکباد پیش کی۔ ساتھ ہی دونوں نے ایک دوسرے

کے گلے میں ایک بار پھر پھولوں کی مالائیں پہنا دیں۔اس کے بعد انھیں نزدیکی رادھا کرشن مندر میں لے جایا گیا جہاں انھوں نے متھا ٹیکا، پوجا ارچنا کی، پھل پھول اور نقدی مورتیوں کے سامنے بڑے احترام سے رکھ دیے اور پھر پجاری سے پرساد لے کر گھر کا رخ کر لیا۔

سُچیتا کی ہدایت پر اس روز عشائیہ کا انتظام آشرم ہی میں کیا گیا تھا تا کہ آشرم کے بچے شرکت کر سکیں۔بھوانی اسکول کے اسٹاف کو بھی بلایا گیا تھا۔علاوہ ازیں سُچیتا راٹھور کی چند رفقائے کار کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔پنکج اور رنبیر کے رشتے دار بھی تھے، وِدوشی ومیترئی کی سہیلیاں بھی تھیں، اور کوشِکی وزبیدہ بھی موجود تھیں۔اس موقعے پر بھی مانسی موسی کو وھیل چیئر پر لایا گیا اور وہ بھی ان خوشیوں کا حصہ بن گئی۔

عشائیہ سے پہلے بچوں نے خوب دھما چوکڑی مچائی۔جس کو جو ہنر آتا تھا اس نے اس کا بھر پور مظاہرہ کیا۔غزلوں، فلمی گیتوں اور وائلن، ماؤتھ آرگن وبنسری پر فلمی دھنوں سے مہمانوں کی خاطر تواضع کی گئی۔بچوں نے سُچیتا میڈم کے لیے ایک خوبصورت تحفہ بھی لایا تھا جو انھوں نے خود ہی بنایا تھا اور جسے آتے ہی انھوں نے میڈم کے ہاتھوں میں تھما دیا اور اس کی خوشحال ازدواجی زندگی کی دعائیں مانگیں۔ان کے بے کراں پیار کو دیکھ کر بھاسکر اور سُچیتا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔آخر کیوں نہ آتے وہ سب تو اب انھیں کے بچّے تھے۔اس کے بعد کھانا کھایا گیا اور سبھی مہمان ایک ایک کر کے چلے گئے۔

باقی رہ گئے بھاسکر اور سُچیتا، جنھوں نے ترنت اپنی آرام گاہ کا رخ کر لیا۔ان کے علاوہ چند قریبی رشتے دار بھی تھے جو وہیں رہ گئے۔ان کے لیے بھی رات کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔خود انتظام وانصرام کرنے والوں نے وقت کی نزاکت کو دیکھ کر باقی سارا کام دوسرے روز پر ملتوی کر دیا۔

بھاسکر اور سُچیتا جب اپنے شبستاں میں داخل ہوئے تو ماحول دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے۔ان کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ شب باشی کی جگہ ہے یا پانچ ستارہ ہوٹل کا سوئیٹ۔ جلوے کی رات کے لیے خواب گاہ جمالیاتی طور پر بہت ہی خوش ذوقی، جذبۂ شوق اور ہنرمندی سے سجائی گئی تھی۔نرم بستر پر گلاب، گل بہار، گیندے اور گڑھل کے پھول ایسے بچھائے گئے تھے جیسے پنکھڑیاں شادی شدہ جوڑے کے استقبال کے لیے دھڑک رہی ہوں۔ دائیں بائیں کارنس اور میزوں پر گلدانوں کو نیچپہ، گل لالہ اور ڈاہلیا کے پھولوں سے آراستہ کیا گیا تھا جبکہ چھت سے چنبیلی، موتیا اور جوہی کی لمبی مالائیں لٹک رہی تھیں۔ بیڈ کے اوپر بھی پھولوں کی چادر سی بنی ہوئی تھی۔اس ساری آرائش سے بچوں کی محبتیں جھلک رہی تھیں۔

کہاں تو بھاسکر اور سُچیتا نے سوچا تھا کہ شبِ عروسی کی رات وہ بغیر کسی ٹھاٹ باٹ کے بڑی سادگی سے گزاریں گے اور کہاں یہ رومان سے بھرپور سہاگ رات...! حقیقت میں اس موقعے پر عام طور پر دولہا اور دلہن کی خوشی دیدنی ہوتی ہے مگر لجائے شرمائے وہ اس خوشی کو مصنوعی سنجیدگی کے پردے تلے دبائے رکھتے ہیں۔لاریب یہ سب کارستانی بیٹیوں کی تھی۔ ان کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ بھاسکر اور سُچیتا کو بیتے ہوئے دن نہیں لوٹا سکتے ہیں نہ ہی ان کی جوانی کی راتیں واپس لا سکتے ہیں جو ماضی بعید میں سماجی جہالت پسندی کی بھینٹ چڑھ گئی تھیں پھر بھی بیٹیوں کی کوشش تھی کہ اگر زندگی کے کچھ لمحے ان پرانی یادوں کو سمیٹنے کے لیے دستیاب ہو سکتے ہیں تو شاید دونوں مطمئن ہوں گے۔

بھاسکر کو بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کہاں اس نے ارادہ کیا تھا کہ وہ نہ کسی جوش اور نہ ہی جنون کا مظاہرہ کرے گا اور کہاں تو خواب گاہ میں قدم رکھتے ہی اس کے جذبات بھڑک گئے، اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اپنی محبوبہ سے بغل گیر ہو کر بوسہ و کنار میں مشغول ہو گیا۔سُچیتا نے اس کے چنگل سے بچنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہی۔آخرش اس نے ہمت جٹا کر بھاسکر کو

دھکا دے دیا اور خود کو الگ کر دیا۔ پھر گویا ہوئی۔

''بھاسکر..... کچھ تو شرم کرو، ہماری عمر یہ سب کچھ کرنے کی نہیں ہے۔''

''نہیں سُچی، عمر کا پیار کے اظہار سے کیا لینا دینا۔ میں نے تمھیں چاہا ہے، چاہتا ہوں اور چاہتا رہوں گا۔ یہ تو ایشور کی مہربانی ہے کہ میں اور تم اتنے برسوں کے بعد آپس میں مل گئے ورنہ میں نے تو امید ہی چھوڑ دی تھی۔''

''میرے ذہن میں بھی یہ گماں نہ گزرا تھا کہ ہم دونوں کا کبھی ملن ہوگا۔ کتنی مصیبتیں جھیلی ہیں میں نے اس ایک رات کے لیے۔ سچ مچ یہ ایک معجزہ ہی تو ہے اور کچھ بھی نہیں۔ دراصل میری بیٹیاں بہت شریر ہوگئی ہیں، یہ سب بناوٹ سجاوٹ ان ہی کی کارستانی ہے۔ وہی میرے پیچھے پڑگئیں کہ تم بھاسکر سے شادی کرلو ورنہ میں تو اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔''

''ہاں میرے پیچھے بھی رنبیر اور وِدوشی پڑ گئے۔ رنبیر مجھے اپنا بڑا بھائی مانتا ہے اور پھر وِدوشی ، دونوں نے ایک ساتھ مل کر مجھے قائل کر دیا کہ میں اس بارے میں غور کرلوں اور ہاں کہہ دوں۔ آخر کار انھوں نے میرے منہ سے ہاں نکلوا ہی دی۔ دیکھو تو کمرے کو کتنی خوبصورتی سے آراستہ کیا ہے۔ میں تو اندر آتے ہی رومانٹک ہوگیا اور تمھیں اپنی بانہوں میں بھرنے کے لیے بے تاب ہوگیا۔ جی کر رہا ہے کہ تمھیں اپنے آغوش میں بھر کر یوں ہی باقی ماندہ زندگی بسر کرلوں۔''

''بھاسکر، (انگلی سے دماغی کھلبلی کا اشارہ کرتے ہوئے) لگتا ہے کہ تم خوشی سے اپنے آپے میں نہیں ہو۔ کہیں ویاگرا وغیرہ تو نہیں کھایا ہے؟ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ آج اپنے آپ کو تم سے بچانا میرے لیے بہت مشکل ہوگا۔'' اس نے قہقہہ لگایا اور دھیرے دھیرے پھر بھاسکر کے نزدیک آ گئی اور اس کی آغوش میں سما گئی۔

زندگی میں پہلی بار دونوں عالم وجد میں کھو گئے۔ جسم کا ہر عضو اپنے مٹنے سے ہمکلام ہوگیا۔ سرمستی کا یہ عالم تھا کہ ایک دوسرے سے بات کرنا چاہتے تھے مگر نہیں کر پا رہے تھے۔ اور پھر دونوں کو سمجھ نہیں آیا کہ سورج کی کرنیں ان کے بیڈ روم میں کب داخل ہوگئیں اور ان کے چہرے کو بوسہ دینے لگیں۔

ایک نئی صبح........!

ایک نئی زندگی....!

ایک نیا تجربہ.....!

صبح ہوتے ہی سُچیتا اور بھاسکر تصوراتی دنیا سے لوٹ کر حقیقی دنیا میں وارد ہوئے۔رات کا وہ خمار یک بیک ذائل ہو گیا۔تمنا تو یہی تھی کہ عمر بھر اسی خیالی عالم میں کھوئے رہیں مگر ایسا ممکن نہ تھا۔زندہ رہنا تھا تو زندگی سے سمجھوتہ کرنا ضروری تھا۔ناشتے کی میز پر دونوں اپنی زندگی کے سفر کے اگلے پڑاو پر تر ڈد کرنے لگے۔مکھن لگے ٹوسٹ کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے سُچیتا بھاسکر سے مخاطب ہوئی۔

''ایک اور خواب جی لیا ہم نے۔کسے معلوم تھا کہ ایسا بھی کبھی ہوگا۔''

''مدعی لاکھ بُرا چاہے تو کیا ہوتا ہے، وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔'' بھاسکر نے چائے کا گھونٹ پیتے ہوئے شعر کا حوالہ دیا۔

''یہ تو ہے۔مگر جب میں ماضی کی گھٹناؤں کے بارے میں سوچتی ہوں تو کپکپی سی محسوس کرتی ہوں۔اگر ہم نے زندگی سے سمجھوتا کیا ہوتا اور تنہا اپنی منزلیں طے نہیں کی ہوتیں نیز ان پر ثابت قدم نہ رہے ہوتے تو آج دنیا کی بھیڑ میں نہ جانے کہاں گُم ہو گئے ہوتے۔خدمت خلق ہی ایک ایسی بھاونا تھی جس نے ہماری زندگی میں کچھ تو رنگ بھر دیا۔ورنہ دونوں بند کمروں میں فائیلوں کی گرد کھاتے ہانپ گئے ہوتے اور نہ جانے کب اور کہاں پیوند خاک ہو جاتے۔''

''مجھے تمھارے بارے میں مختلف ذرائع سے خبریں ملتی رہتی تھیں اور سچ مانو تو مجھے تمھارے ارادوں سے تحریک مل جاتی اور پھر میں ایک نئے سفر پر چل نکلتا۔یہ ساری کاروباری عملداری جو کچھ بھی میں نے تعمیر کی وہ خود غرضی کی وجہ سے نہیں بنائی بلکہ میں بھی اسی کوشش میں

لگا رہا کہ اس فراموش زدہ ریتیلے علاقے کو خوشحالی کی جانب بڑھا سکوں اور روزگار کے نئے نئے امکانات فراہم کرسکوں۔ میری اس محنت ومشقت کا جو بھی انجام ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ میں تو اکیلا ہی تھا، نہ کوئی رشتہ دار اور نہ کوئی دوست حبیب، اس لیے نہ کوئی حرص تھی اور نہ ہی کوئی لالچ۔''

''میرے ساتھ بھی عجیب سا اتفاق ہوا۔ شادی میں نامنظوری، پتا جی کی چھوڑی ہوئی خطیر رقم، اعلیٰ تعلیم، مجرد مادریت کا تجربہ جس نے مجھے یتیم خانہ کھولنے کی تحریک عطا کی، پھر اچانک قحطِ مسلسل کے روپ میں قہرِ خدا کا نازل ہونا- یہ سب مجھے لگتا ہے کاتبِ تقدیر نے میرے نصیب میں پہلے ہی سے رقم کیا تھا۔ ورنہ کہاں وہ نہتی لاچار سی سُچیتا جو سماجی جبر کے آگے سرنگوں ہونے پر مجبور ہوگئی تھی اور کہاں یہ پراعتماد، خوددار اور مبارز دیدی جو سماوی مصائب کا مقابلہ کرنے کے لیے سینہ تان کر کھڑی رہی۔ اب تو مجھے یہ کسی سپنے سے کم نہیں لگتا۔

خیر بھاسکر چھوڑ دو ان باتوں کو، مجھے یہ بتاؤ کہ آگے تمھارا کیا خیال ہے۔ تمھارا دفتر تو یہاں سے بہت دور ہے اور روزانہ وہاں آنا جانا ممکن نہیں ہوگا۔ اِدھر میں ہوں کہ سارا جال یہیں پر پھیلایا ہوا ہے، اس کو ترک کر کے چلے جانا تو ممکن نہیں ہے۔ پھر ہم کیا آئندہ بھی الگ الگ ہی رہیں گے؟ وِدوشی رنبیر کو چھوڑ کر وکالت کے لیے جودھپور چلی گئی اور میترئی اور پنکج نے نزدیک ہی شہر میں ایک بڑے اسپتال میں کام کرنا شروع کیا ہے۔ باقی رہے تم اور میں! کچھ سمجھ نہیں آرہا ہے۔''

''تم ان باتوں کی زیادہ چنتا مت کرو۔ میری کمپنیوں کی شاخیں کئی شہروں میں پھیلی ہوئی ہیں، میں رنبیر کو جودھپور برانچ میں تعینات کروں گا جہاں وہ آزادانہ طور پر اس کے انصرام کا ذمہ دار ہوگا۔ رہا میرا سوال اس کے بارے میں بھی میں نے سوچ رکھا ہے کہ میں اپنا ہیڈ کوارٹر یہیں بھوانی پور منتقل کروں گا اور پھر یہیں سے اپنی کمپنیوں کی دیکھ ریکھ کیا کروں گا۔ البتہ مہینے میں کئی روز دورے پر رہنا ناگزیر ہوگا۔ میں نے یہ بھی سوچا ہے کہ میں یہاں بھی زمین خرید کر اشیائے خوردنی بنانے کا ایک اچھا سا کارخانہ لگاؤں گا۔ اس بارے میں میری

ماہرین کے ساتھ بات چیت ہو رہی ہے۔ علاوہ ازیں میں نے یہ طے کیا ہے کہ میں سویتا انٹرپرائزز کی مارکیٹنگ وِنگ کی شراکت بھوانی کواپریٹو سے کراؤں گا تاکہ ہم تمھارے کار خانوں میں تیار شدہ مال کی مارکیٹنگ کی ذمے داری سنبھال سکیں۔ اس طرح تم لوگوں کو اس پریشانی سے چھٹکارا ملے گا اور تم لوگ صرف پیداوار کی جانب اپنا دھیان مرکوز کرسکو گے۔ نیز دیش کا ایک بہت بڑا مارکیٹ بھی یہاں کے کاریگروں کو دستیاب ہوگا۔"

"یہ تو بہت ہی نیک خیال ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ تم اس میں کامیاب ہو گے۔ پھر میں صرف بھوانی کواپریٹو، بھوانی برانڈ اور یتیم خانے کی طرف توجہ دے سکوں گی۔ تمھاری اور ہماری کمپنیوں کے درمیان اس اتحادِ عمل (Synergy) سے بہت ہی اچھے نتائج برآمد ہوں گے۔"

بھاسکر اور سُچیتا کی زندگی میں زیادہ کچھ بھی نہ بدلا البتہ اب وہ ایک دوسرے پر نربھر تھے اور ایک دوسرے کی پسند اور ناپسند کی فکر کرنے لگے تھے۔ بھاسکر کل کیا پہن کر جائے گا، کپڑے پریس کر کے آئے یا نہیں، کھانے میں کیا بنے گا اور بھاسکر کو کون سی چیز زیادہ پسند ہے، ان سب چیزوں کا خیال رکھنا سُچیتا کو اپنا فرض محسوس ہونے لگا۔ دوسری جانب بھاسکر کو بھی سُچیتا کی فکر رہنے لگی، اس کی پسند کی خریداری کرنے کے لیے اس کو ہمراہ لے جانا پڑتا، اس کے لیے ساڑھیاں اور دیگر ضروریاتِ زندگی خریدنی پڑتیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کا جنم دن یاد رکھنا پڑتا تاکہ اس روز اچھا سا تحفہ لا سکے۔ مثالی میاں بیوی کا تعامل تو صدیوں سے یوں ہی چلا آرہا ہے اور اچھی ازدواجی زندگی کے لیے بے حد ضروری ہے۔ تاہم دونوں کی زندگی پہلے کی طرح ہی چل رہی تھی۔ بھاسکر اپنی بزنس میں رات دن پھنسا رہتا اور سُچیتا اپنے یتیم خانہ، اسکول اور خدمتِ خلق کے دوسرے کاموں میں مصروف رہتی۔ ان کو ایک دوسرے سے مل بیٹھ کر آرام سے بات کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ اس بات پر جب وہ غور وفکر کرتے تو من ہی من میں ہنس دیتے۔ شادی تو ہوئی تھی، نہ ہنی مون کے لیے کسی غیر ملکی صحت افزا مقام پر گئے، نہ رومانس کے لیے باقی زندگی کے کام بھول گئے اور نہ ہی اپنے فوکس سے

ہٹ کر اپنی نجی زندگی پر دھیان دیا۔ انھوں نے یہ بھی فیصلہ کرلیا کہ وہ بچے پیدا نہیں کریں گے۔ بھگوان کا دیا جو کچھ تھا وہ اسی پر قناعت کرنا چاہتے تھے۔ پھر وِدوشی تھی، میترئی تھی اور کوشکی اور اس جیسے بیسیوں بچے تھے جوان کو اپنا سمجھتے تھے گو ان کے ساتھ اب نہیں رہتے تھے۔

(۳۷)

وقت کے ساتھ ساتھ دیش بھی بدلتا جا رہا تھا۔ گذشتہ چند دہائیوں میں کئی تبدیلیاں آئیں۔ ایک زمانہ تھا کہ سوشلزم اور غریبی ہٹاؤ کے نعرے فضا میں گونجتے رہتے تھے۔ ٹیکس کی شرح بہت زیادہ تھی۔ پھر قومیانے کا دور چلا۔ جیون بیمہ کا شروع میں ہی قومیانہ ہو چکا تھا۔ پہلے بنکوں کا قومیانہ ہوا، پھر جنرل انشورنس کا، اس کے بعد تجارت کی درآمد و برآمد کا اور پھر اناج کی تقسیم کاری کا۔ حالانکہ اس دور میں اناج اور دودھ کی پیداوار میں انقلاب آ گیا مگر نہ غریبی ہٹی اور نہ ہی اشیائے خوردنی کی قلت مٹ سکی یہاں تک کہ کئی اقدامات واپس لینے پڑے۔ علاوہ ازیں صنعتی پیداواریت میں کافی کمی آ گئی۔ نیشنلائزیشن کی ناکامی کو دیکھتے ہوئے نویں دہے میں سرکار نے بازار کھولے، قومیانے کے بدلے الٹا سرکاری کمپنیوں کو پرائیویٹ ہاتھوں میں اس خیال سے سونپا گیا کہ سرکار ناحق فالتو کاموں میں پھنس چکی ہے جو اس کے دائرۂ کار میں نہیں آتے ہیں جیسے ہوٹل، کپڑا بنانے کے کارخانے، ایئرلائنز، ادویات کے کارخانے وغیرہ۔ سرکار نے بہت ساری سرکاری اکائیوں جیسے ایئر انڈیا وغیرہ کو پرائیویٹ ہاتھوں میں سونپ دیا۔ ان کی دلیل ہے کہ سرکار کو صرف انسان اور معاشرے کی بنیادی ضرورتوں سے غرض ہونی چاہیے جبکہ ہوٹل چلانا، ہوائی جہاز اڑانا یا کپڑے، کیمیات وادویات کے کارخانے چلانا ان کا کام نہیں ہے۔ اس دلیل میں کافی وزن ہے کیونکہ ان سب چیزوں کی نگرانی کرنا حکومت کے بس کی بات نہیں ہے۔ ان اقدامات سے گذشتہ سات دہائیوں کے ذہنی رجحان کو شدید جھٹکا لگا ہے۔ سرکار کو قریباً پینتالیس برسوں کے بعد اس بات کا احساس ہوا

کہ اس نرغے میں پھنسنے کے باعث وہ بنیادی انفراسٹرکچر کو نظرانداز کر رہی تھی جس کے سبب ہمارا ملک بہت پیچھے رہ گیا ہے اور پیداواریت نشیب تک پہنچ گئی ہے۔اس لیے ایک کے بعد ایک سرکاریں قصیدے تو اشتراکیت کے پڑھ رہی تھیں مگر حقیقت میں سرمایہ داری کو بڑھاوا دینے لگیں۔فرد کو اجتماع پر ترجیح دی جانے لگی، اس کے حقوق کی حفاظت ہونے لگی اور انفرادی ترقی کے راستے کھول دیے گئے۔ٹریڈ یونین سرگرمیوں کو کافی حد تک لگام لگائی گئی۔وہ بات بات پر سٹرائیک کرنے کی دھمکیاں بند ہوگئیں اور کارخانوں و دفتروں میں پیداواریت کا اضافہ ہونے لگا۔انجام کار گزشتہ کئی برسوں کے دوران ملک کی اقتصادی حالت میں کافی سدھار آگیا اور وہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا ہونے کا دعویدار بن گیا۔

اکیسویں صدی کا سورج طلوع ہونے کے بعد نئی سوچ و فکر نے ہماری سرکاروں کو بہت متاثر کیا اور وہ عام رعایا کی معیار زندگی کو بہتر بنانے کے لیے فکرمند ہوگئیں۔کس کو گماں تھا کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ سرکار گھر گھر پائخانہ، پانی، بجلی، گیس اور دیگر بنیادی ضروریات دستیاب کرنے کو اپنا اہم فریضہ سمجھے گی۔کسانوں کو مالی طور پر خود انحصار بنانے کی جانب دھیان دیا جائے گا اور خواتین کی بہبودی و معاشی آزادی اور خاص طور پر لڑکیوں کی تعلیم پر زور دیا جائے گا۔یہ تبدیلیاں جہاں انفرادی سطح پر انسان کے لیے خود توقیری بڑھا دیتی ہیں وہیں معاشرے کی ترقی کے لیے بے حد ضروری ہیں۔

تاہم سرمایہ دارانہ نظام کے اپنے مسائل ہوتے ہیں۔اس نظام کی کامیابی تبھی ممکن ہے جب سرکاری کنٹرول مختصر ترین ہو مگر جتنی بھی ہو وہ خالص اور دیانتدار ہو۔لائسنس سسٹم صفر کے برابر ہو، افسر شاہی کے اختیارات واجبی ہوں اور صنعت کاروں کو بات بات پر افسروں کے پاس نہ جانا پڑے۔آزاد معیشت کے اعلان کے بعد دیکھا گیا کہ قوانین میں بدلاؤ کے لیے سرکار کو کافی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ 'غربت' کئی اہم سیاسی پارٹیوں کی کٹھ پتلی ہے اور غریب عوام ان کا ووٹ بنک بن چکا ہے۔دوسری جانب افسر شاہی اپنے اختیارات چھوڑنے پر کسمسا رہی ہے اور کوئی نہ کوئی اعتراض کھڑا کرتی ہے۔پھر بچولیوں کی روزی روٹی

بھی تو بند ہو رہی ہے۔ اچھے صنعتی نظام کے لیے سرکاری نگاہبانوں کا ایماندار، سخت اور چوکس ہونا ضروری ہے جبکہ رعایا میں خواندگی، بیداری، دیانتداری اور فرائض کا احساس ہونا لازم ہے۔ جس معاشرے میں بے ایمانی، رشوت خوری اور کنبہ پروری رگ رگ میں سمائی ہو وہاں کے انصرامی نظام کو ہر قدم پر رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پرائیویٹ صنعت کاری پر زیادہ زور دینے سے حال ہی میں کسانوں کے دلوں میں بھی سرکار کے خلاف طرح طرح کے خدشات پیدا ہوئے اور وہ سڑکوں پر اتر آئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دہلی بارڈر پر کسان پورے سال احتجاج کے طور پر دھرنا دے کر بیٹھ گئے اور اُٹھنے کا نام بھی نہ لیا۔ ان کی پُشت پناہی وہ سیاسی پارٹیاں کرنے لگیں جو ہندوستان کی ترقی اور یکجہتی کی خواہاں نہیں ہیں۔

جہاں ایک جانب ملک میں تیزی سے ہو رہی ترقی نظر آ رہی ہے وہیں دوسری جانب سرکاری نوکریوں میں کمی ہو رہی ہے اور پرائیوٹ کمپنیوں میں حاجت کے حساب سے ہی بھرتی ہو رہی ہے۔ وہ زمانے عنقا ہو گئے کہ سرکاری نوکری میں آدمی کام کرے یا نہ کرے اس پر گاج گرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اب تو پرائیویٹ سیکٹر میں آدمی کی ضرورت تب تک ہی ہے جب تک وہ اپنا سو فیصدی دے سکتا ہے ورنہ باہر کا راستہ دکھایا جاتا ہے۔ سرکاری نوکریوں کے ابھاؤ اور کٹوتی کی لٹکتی ہوئی تلوار نے ملازم پیشہ لوگوں کو بہت ہی محتاط بنا دیا ہے۔ جس کے باعث نوجوانوں میں عجیب سی بے قراری نظر آ رہی ہے۔

چنانچہ بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ بے روزگاری بھی بہت بڑھ گئی ہے اس لیے سیاسی پارٹیاں اپنی روٹیاں سینکنے میں منہمک ہیں۔ سارے معاشرے میں بے چینی کی ایک زیریں لہر دوڑ رہی ہے۔ حقیقت میں بے روزگاری کی سب سے بڑی وجہ ملک کی بے لگام بڑھتی ہوئی آبادی ہے جس پر کسی کا کوئی کنٹرول نہیں ہے۔ ایمرجنسی کے دوران اس کارروائی کو لگام لگانے کے لیے سرکار نے کئی اقدامات اُٹھائے مگر اس وقت کی مخالف سیاسی پارٹیوں نے پُرزور مخالفت کی اور یہ نہیں سوچا کہ ایسے اقدامات مستقبل میں ملک کی ترقی کے ضامن بن سکتے ہیں۔ سیاسی پارٹی جو اس وقت ان اقدامات کی برائی کر رہی تھی بعد میں اقتدار میں آ کر آبادی

کو حد میں رکھنے کی دہائی دے رہی ہے۔لیکن سانپ تو بھاگ گیا اب لکیر پیٹنے سے کیا فائدہ؟

عصری تناظر میں نجی کاروباریوں خاص کر نئے صنعت کاروں سے کافی امیدیں وابستہ ہیں۔ بھاسکر کی کاوشوں کو اس تبدیلی نے کافی مہمیز لگائی اور وہ نئی نئی جہات میں اپنا کاروبار پھیلانے کی سوچنے لگا۔بھوانی پور میں اور کون کون سی صنعتیں لگائی جاسکتی ہیں اس حوالے سے وہ اور اس کی کمپنی کے بورڈ ممبران مغز کاوی کرنے لگے۔نیز وہ اس خطے سے باہر دوسرے کاموں میں صنعت کاری کرنے کے لیے بھی غور کرنے لگے۔

اس کے برعکس سُچیتا نے نہ صرف وَردان اَناتھ آشرم بلکہ وَردان اسکول اور ہوسٹل کی بھی کافی توسیع کی تا کہ بھوانی پور اور پاس پڑوس کی لڑکیاں وہاں پر تعلیم سے آراستہ ہوسکیں۔ لڑکیوں کو تعلیم دینا اس کی زندگی کا پہلا نشانہ بن گیا۔اس نے اسکول کے علاوہ ایک کالج بھی کھولنے کا ارادہ کیا جس کے لیے اس نے تگ ودتاز شروع کی۔اس کے باوجود سُچیتا نے اپنے اضافی مقصد سے ہاتھ نہیں کھینچا، وہ مسلسل ان سبھی مراکز کا دورہ کرتی رہی اور کاریگروں کی مشکلیں حل کرتی رہی جہاں گاؤں کی خواتین سوتی کپڑا بُننے،ان کو رنگنے اور اہم گھریلو اشیا بنانے میں مصروف رہتی تھیں۔وہ اس بات کو یقینی بناتی کہ ہر کام صحیح طریقے سے پایۂ تکمیل تک پہنچے اور 'بھوانی برانڈ' میں کسی طرح معیار کی گراوٹ نہ آنے پائے۔یہ ایک ایسا برانڈ تھا جو نام دیکھ کر ہی بکتا تھا کیونکہ اس میں برسوں کی محنت اور مشقت شامل تھی اور اس کے اعلیٰ معیار میں کبھی کوئی کمی نہیں آنے دی گئی۔اُدھر زبیدہ نے بھی اپنے کام میں کافی ترقی کی تھی اس کا اسکول خوب چل رہا تھا، وہ اسلام پورہ میں مسلم لڑکیوں کو تعلیم دینے میں بہت حد تک کامیاب ہو چکی تھی اور اس کے اسکول کے نتائج بہت اچھے آرہے تھے۔اس کے علاوہ اس نے بہت ساری گھریلو خواتین کو دستکاریاں اور دیگر گھریلو سامان بنانے کی تربیت بھی دی تھی اور اب وہ سب ان کاموں میں انہماک کے ساتھ جٹی رہتی تھیں۔

چنانچہ اب بھوانی پور ایک چھوٹا سا شہر لگ رہا تھا یہاں کے مسائل بھی بڑھ چکے تھے۔ ایک مسئلہ جس کی طرف سُچیتا راٹھور کا دھیان گیا وہ تھا روایتی مشترکہ خاندانوں کا یگانہ اکائیوں میں بٹ جانا۔ ان یگانہ کنبوں کے سبب لوگ اپنے والدین کو نظر انداز کرنے لگے تھے اور بوڑھے بزرگ بے سہارا ہوتے جا رہے تھے۔ اس مسئلے کی وجہ سے وہ کافی تردّد میں پڑ گئی اور اس کا حل ڈھونڈنے میں مصروف ہوگئی۔ دراصل سُچیتا کی روح اس پھڑ پھڑاتے چکاوک کی مانند تھی جو سریلی تان چھیڑتا ہوا آسمان کی بلندیوں پر اڑان بھرنے کا متمنی ہوتا ہے۔ اس نے بھاسکر سے مشورہ کیا۔

''بھاسکر، میں سوچ رہی ہوں کہ کہیں تھوڑی بہت اور زمین خرید لوں۔''

''کس لیے...؟'' بھاسکر سراپا استعجاب بن گیا۔

''میں چاہتی ہوں کہ ترک شدہ عمر رسیدہ لوگوں کے لیے ایک 'بزرگ خانہ' (ورِدھ آشرم) کھول دوں۔ ہمارے ملک میں تیزی سے بڑھتی ہوئی صنعتی ترقی اور دست نِگر آبادی کی مسلسل نقل پذیری کے باعث خاندان چھوٹی چھوٹی اِکائیوں میں بٹ رہے ہیں اور صاحب خانہ یگانہ کنبے کے علاوہ کسی اور کو اپنے ساتھ رکھنا پسند نہیں کرتا۔ ایک جانب عمر بڑھنے کے ساتھ بوڑھے اور ضعیف لوگوں میں جسمانی، ذہنی، نفسیاتی اور سماجی کجرویاں پیدا ہوتی ہیں اور ان کو سنبھالنا بہت مشکل ہوتا ہے تو دوسری جانب کماؤ اولاد معاشی اور سماجی آزادی کی خواہاں ہوتی ہے اور کسی اور کی موجودگی یا مداخلت برداشت نہیں کرتی۔ اس لیے وہ اپنے فرائض سے سبکدوش ہو کر بزرگوں کو یا تو یوں ہی بے سہارا چھوڑ دیتی ہے یا پھر 'بزرگ خانوں' کے سپرد کرتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہاں ان لاچار بوڑھوں کو کتنی بھی سہولتیں دستیاب کیوں نہ ہوں لیکن وہ گھر کی گرماہٹ، ذائقہ دار کھانا اور بچوں کی کلکاریاں سننے کو نہیں ملتی ہیں یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو متروک، تنہا اور لاوارث سمجھتے ہیں۔ مجھے اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ بزرگ خانہ

ان کو چھت تو مہیا کر سکتا ہے مگر بال بچوں کی محبت نہیں دے سکتا، مکینوں کی رفاقت تو مہیا کر سکتا ہے مگر خونی رشتوں کا تفاعل یقینی نہیں بنا سکتا ہے، ان کے لیے تفریحی سامان تو دستیاب کر سکتا ہے مگر دل جوئی و دل جمعی کی صورت پیدا نہیں کر سکتا ہے۔ تاہم میرا یہ ماننا ہے کہ اگر آئیڈیل چیز دستیاب نہ ہو تو کم کے کم اس کا متبادل تو پیش کیا جا سکتا ہے۔''

''ہاں سچی، تمھارا خیال سو فیصد صحیح ہے۔ یہ ہمارے ہم عصر معاشرے کی سب سے اہم پرابلم بن رہی ہے اور اگر اس کا تدارک نہ کیا جائے تو آگے چل کر بہت بڑا مسئلہ بن کر ابھرے گی۔ ہمیں اس کے لیے اپنی کمر کسنی ہی پڑے گی۔ البتہ سوچتا ہوں کہ تم اکیلی جان کتنا کچھ کر پاؤ گی، کہیں تم اتنے سارے کاموں کے دباؤ میں آ کر مرجھا نہ جاؤ، آخر انسانی جسم کتنا بوجھ برداشت کر لے گا، ایک روز تو جواب دے گا ہی۔ بھگوان نہ کرے وہ دن دیکھنے کو ملے۔ میری منشا صرف اتنی ہے کہ تم آگے جو کچھ بھی قدم اٹھاؤ، سوچ سمجھ کے اٹھا لینا اور یہ دیکھ لینا کہ تم اس کا بار اٹھا سکو گی یا نہیں۔''

''تھینک یو بھا سکر فار یور کائنڈ ورڈس۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابھی تک میری زندگی کا مقصد پورا نہیں ہوا۔ ابھی بہت کچھ باقی رہ گیا ہے۔ میں تمھارا تشویش میں مبتلا ہونا سمجھ سکتی ہوں۔ اسی لیے میں نے پہلے تم سے بات کرنا مناسب سمجھا۔ دراصل میں نامرکوزیت (decentralisation) میں یقین رکھتی ہوں۔ میں نے ہر شعبے میں رہبروں کی ایسی ٹیم بنائی ہے جو خود سے فیصلے لیتی ہے اور اس اکائی کو آگے لے جانے کی کوشش کرتی ہے۔ ان کی وجہ سے میرا کام اب بہت ہی کم ہو گیا ہے۔ میں صرف آگے راستے کا تعین اور منزلوں کی نشاندہی کرتی ہوں باقی ان کا کام ہوتا ہے۔ اس لیے مجھے نہیں لگتا ہے کہ یہ ایسا کام ہو گا جس سے میری ہمت جواب دے سکتی ہے۔ بس تمھاری اَشیرباد کی ضرورت ہے۔''

''میری اَشیرباد ہمیشہ تمھارے ساتھ ہے سچی۔ میں ہر پل تمھاری کامیابی کی دعائیں کرتا ہوں۔ البتہ میں سمجھتا ہوں کہ عقلمند وہ ہوتا ہے جو ہر مرحلے پر اپنی قوتوں، کمزوریوں اور مواقع کا جائزہ لیتا رہے جس کو انگریزی میں SWOT Analysis کہتے ہیں تا کہ نہ

صرف وہ صحیح سمت کا تعین کر سکے بلکہ اسے منزل پانے میں زیادہ کٹھنائی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ مجھے تم سے بہت ساری امیدیں ہیں مگر کیا کروں اب میں ایک ایسے بندھن میں پھنس گیا ہوں جو مجھے ہر لمحے یاد دلاتا ہے کہ تم ایک شوہر بھی ہو اور تمھارا فرض ہے کہ اپنی شریک حیات سے وہ سب اندیشے ساجھا کرلو جو تمھارے من میں گاہے بہ گاہے پیدا ہوتے ہیں تا کہ وہ صحت مند رہے اور اس کی عمر دراز ہو۔

جہاں تک بزرگ خانہ کا سوال ہے، سُچی یہ ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے جس کو پورا کرنے کے لیے شاید تمھاری آٹھوں پہر کی حاضری ضروری ہوگی۔ جو بوڑھے بزرگ اس اولڈ ایج ہوم میں رہیں گے وہ سادھارن نہیں ہوں گے بلکہ اکثر و بیشتر ابنارمل ہوں گے، انھیں اپنانا اور ڈھارس بندھانا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہوگا۔ یہ تجربہ تمھارے لیے اَناتھ آشرم سے بالکل علٰیحدہ ہوگا اور میں چاہتا ہوں کہ تم اس کے لیے تیار رہو۔ اطمینان رکھو میں مرتے دم تک تمھارا ساتھ دیتا رہوں گا۔"

سُچیتا راٹھور نے اپنے تعلقات کا استعمال کر کے بزرگ خانہ کے لیے زمین ڈھونڈ لی اور اپنے ٹرسٹ کا روپیہ خرچ کر کے اس پر دو منزلوں کی ایک حسب ضرورت عمارت کھڑی کر دی۔ سرمایہ جاریہ کے لیے اسے پھر انہی دروازوں پر دستک دینی پڑی جو اس کے جانے پہچانے تھے اور جہاں سے وہ کبھی مایوس نہیں لوٹی تھی۔ چنانچہ وقت کافی آگے بڑھ چکا تھا اور کئی نئے ایثار پسند لوگ صفحۂ ہستی پر نمودار ہو چکے تھے اس لیے ان سے بھی رابطہ کیا گیا اور بہت سوں نے مایوس نہیں کیا۔ بھاسکر نے بھی حسب مقدور اپنے ٹرسٹ کی جانب سے سرمایہ فراہم کیا۔ حیرت تو اس بات کی تھی کہ اس پروجیکٹ کے لیے زبیدہ نے بھی حسب مقدور چندہ دیا۔ اس کے پاس جو کچھ بھی بچا ہوا سرمایا تھا وہ اس نے بطور اعانت پیش کیا۔

عمارت کے کمرے کھلے اور ہوادار بنائے گئے اور مکینوں کی حفاظت کا خاص خیال رکھا گیا۔ سبھی کمروں کے ساتھ بالکونیاں بنائی گئیں جن کو صبح سویرے سورج کی کرنیں بوسہ دیتی تھیں۔ سردیوں کے موسم میں بالکونیوں میں کرسی پر بیٹھ کر بوڑھے ستاتے رہتے۔ بلڈنگ

کے باہر ایک باغ بھی بنایا گیا جس کی خوب شجرکاری کی گئی تاکہ پیڑوں کے سائے تلے مکین بزرگ آرام فرماسکیں نیز ایک دوسرے سے تعامل کرنے میں بھی کامیاب ہوں۔غرضیکہ ایک سازگار ماحول پیدا کیا گیا تاکہ مکینوں کو اپنا گھر نہیں تو گھر نما آشرم کا احساس ہوسکے۔اس کارروائی میں قریباً ایک سال لگ گیا۔سُچیتا وقتاً فوقتاً عمارت کا معائنہ کرتی اور متعلقہ لوگوں کو جلدی کام نپٹانے کی تاکید کرتی۔بزرگ خانہ کے لیے ملازمین کی بھی ضرورت تھی۔اس بار بھی سُچیتا نے وہی پرانا فارمولا اپنایا جو اس نے یتیم خانہ چلانے کے لیے اپنایا تھا۔مناسب تعداد میں ان لوگوں کی بھرتی کی گئی جو سوبھاؤ سے حلیم اور نیک خصلت تھے اور بزرگوں کی دیکھ بھال کرنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ان کے لیے نرسنگ کی تربیت کا بھی انتظام کرایا گیا تاکہ منتخب اسٹاف بوڑھے اور ضعیف بزرگوں کی دایہ گیری کرنے کے قابل بن جائے۔

پروجیکٹ کے مکمل ہونے پر سُچیتا راٹھور کو بہت شادمانی ہوئی اور اس نے وہاں پر رہنے کے انتظامات کے بارے میں مقامی ذرائع ابلاغ میں تشہیر کی۔اشتہار چھپنے کی دیر تھی کہ کئی سماج سیوک بے گھر و بے وسیلہ بوڑھوں کو لے کر اس کے پاس پہنچ گئے۔سُچیتا جو اپنے آفس میں بیٹھی تھی یہ منظر دیکھ کر اور ہر ایک کے حالات سن کر بہت افسردہ ہوگئی۔ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو اپنے ذاتی گھروں میں رہتے تھے مگر دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا۔کچھ بوڑھوں کو ان کے بے رحم وارثوں نے مار پیٹ کر اپنے ہی گھر سے بے دخل کر دیا تھا اور وہ راستے پر یا مندر کے باہر بھیک مانگنے پر مجبور ہو چکے تھے۔پھر ایسے بھی کچھ بوڑھے تھے جن کی اولاد نے انھیں خود آکر اور طرح طرح کے بہانے بنا کر سُچیتا راٹھور کے حوالے کر دیا۔وہ فکر و تردّد کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گئی کہ کیا انسان اتنا نیچے گر جاتا ہے کہ اس کے دل میں محبت اور مروّت نام کی کوئی چیز نہیں رہتی۔شاید یہ انسانیت کا دوسرا رخ تھا جو اب تک اس نے نہیں دیکھا تھا۔ان میں زیادہ تر ایسے بزرگ تھے جو قدرتی حادثات کے شکار نہیں ہوئے تھے بلکہ انسانی طمع و اَنا کے دلدل میں پھنس گئے تھے۔جو جوان بیٹے ان کو چھوڑ کر چلے گئے تھے ان کو شاید یہ گمان بھی نہ تھا کہ ایسا وقت ان کے ساتھ بھی ایک روز آسکتا ہے۔ان کے والدین کو پناہ لینے کی جگہ تو مل

گئی، شاید ان کو وہ بھی نصیب نہ ہو۔

اقوام متحدہ نے یکم اکتوبر کو 'بین الاقوامی یومِ بزرگاں' منانے کا اعلان کیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں لوگوں کو عمر کے بڑھنے کا احساس دلایا جائے اور بوڑھے ہو رہے لوگوں پر اس کے اثرات کی نشاندہی کی جائے تا کہ یہ یقینی بن جائے کہ لوگ عزت سے بڑھاپے میں قدم رکھیں اور سماج میں شرکت کرنے کے مواقع ان کو پورے حقوق کے ساتھ بحیثیت ایک شہری کے فراہم ہوں۔ سُچیتا نے بھاسکر سے مشورہ کر کے یکم اکتوبر کو ہی اس بزرگ خانہ کا، جس کا نام 'وَردان ورِدھ آشرم' رکھا گیا، افتتاح مقرر کیا۔ راجستھان کے وزیر اعلیٰ کو بطور خصوصی مہمان کے مدعو کرنے کے لیے سُچیتا راٹھور خود ہی چلی گئی۔ اس نے نہ صرف اپنا بلکہ اپنی سنستھاؤں کا تفصیل سے تعارف پیش کیا حالانکہ وزیر اعلیٰ کو پہلے ہی سے بہت ساری جانکاری حاصل تھی۔ وزیر اعلیٰ نے سُچیتا کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا اور پھر اپنے حاضر ہونے کا پورا بھروسہ دلایا۔

یکم اکتوبر کو 'وَردان ورِدھ آشرم' کا افتتاح ہوا۔ بہت سارے مہمان بلائے گئے تھے۔ اکثر و بیشتر حاضر ہوئے۔ بھاسکر اور اس کے قریبی رفقائے کار، دونوں بیٹیاں اور ان کے شوہر، زبیدہ اور اس کے قریبی رفقائے کار، وَردان سنستھا سے جڑے لوگ اور یتیم خانہ کے بچے سب موجود تھے۔ ممبئی سے کوشکی بھی آئی ہوئی تھی۔ اس نے آشرم کے لیے کافی مالی معاونت کی تھی۔ علاوہ ازیں ذرائع ابلاغ کی طرف سے کئی رپورٹر حاضر ہوئے تھے۔ سب سے پہلے سُچیتا راٹھور نے مہمان خصوصی اور دوسرے مہمانوں کا گلدستوں سے خیر مقدم کیا اور پھر وِدوشی نے استقبالیہ تقریر کی جس میں نہ صرف مہمانوں کا استقبال کیا گیا بلکہ وَردان سنستھا کے ماضی کی حصولیابیوں کو بھی اُجاگر کیا گیا اور آخر میں 'بزرگ خانہ' کا مقصد بیان کیا گیا۔ اس کے بعد سُچیتا راٹھور نے تقریر کرتے ہوئے وَردان سنستھا کے ارتقائی سفر پر روشنی ڈالی جو اس کی ذاتی زندگی سے ہم آہنگ تھی، پھر اس سنستھا کی حصولیابیوں کو اجاگر کیا یہاں تک کہ 'بھوانی تحریک' کا بھی تفصیل سے ذکر کیا کہ کس طرح بھوانی پور نے سماوی آفتوں کا مقابلہ کر کے اس خطے کو

پیداواریت اور خود کفیلی کی مثال بنا دیا اور آخر میں اس نئے قدم یعنی 'وَردان وِردھ آشرم' کھولنے کے اغراض ومقاصد بھی مختصراً بیان کیے۔ بقول سُچیتا راٹھور "ہر انسان میں بہت کچھ حاصل کرنے کا مادہ ہوتا ہے اگر وہ چاہے تو۔ اسے المیہ نہ کہیں تو اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ انسان تعمیر کی بجائے تخریب کا مطیع بن چکا ہے اور اس کے اندر محبت، ایثاریت اور انسان دوستی کا جذبہ مفقود ہو چکا ہے۔" پھر مہمان خصوصی نے بزرگ خانہ کا افتتاح کیا اور اس کے ترنت بعد تقریر کی جس میں اس نے نہ صرف وَردان سنستھا کی کامرانی کو بیان کیا اور سُچیتا اور اس کے رفقائے کار کو بدھائی دی بلکہ سنستھا کے لیے سرکار کی جانب سے پانچ لاکھ روپے دینے کا اعلان بھی کر دیا۔ آخر میں بھاسکر نے مہمان خصوصی اور دیگر مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور مہمان خصوصی سے وَردان وِردھ آشرم میں داخلہ لینے والی پہلی ذی روح کو مالا پہنا کر استقبال کرنے کی درخواست کی۔

آشرم میں سب سے پہلے داخلہ لینے والی بوڑھی ضعیف عورت کوئی اور نہیں بلکہ مانسی موسی تھی۔ سب اس کو دیکھ کر حیران ہو گئے۔ اس کو وھیل چیئر پر بٹھا کر لایا گیا تھا۔

سُچیتا راٹھور نے بہت کوشش کی تھی کہ موسی بدستور اس کے ساتھ رہے اور اپنی چنتا کرنا چھوڑ دے۔ وہ بہت دیر تک موسی کو بھروسہ دلاتی رہی کہ وہ خود اس کی دیکھ بھال مرتے دم تک کرے گی مگر مانسی موسی نے ایک نہ سنی۔ اس کا کہنا تھا کہ جو جگہ جس کے لیے موزوں ہو اس کو وہیں پر شرن لینی چاہیے۔ مانسی موسی کا بیٹا جب سے گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا واپس مڑ کر نہیں آیا۔ اب تو بہت سال ہو گئے تھے اس بات کو۔ کہاں چلا گیا تھا کوئی کہہ نہیں سکتا تھا۔ کسی نے اسے کہیں دیکھا تک نہیں، زندہ تھا یا مردہ، کسے معلوم؟ انسان ماں باپ کو چھوڑ کر چلا جائے تو اتنا غم نہیں ہوتا جتنا کہ اس کے بھاگنے کے بعد اگر وہ بالکل رابطہ نہ بنائے اور اپنے بارے میں اطلاع نہ دیتا رہے۔ تاہم ماں تھی کہ اسے کسی بات پر وشواس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھی کہ اس کا لڑکا گھر چھوڑ کر کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہوگا۔ اسے کبھی نہ ختم ہونے والی ایک امید تھی جو اسے ڈھارس بندھائے جا رہی تھی اور سرگوشیاں کر رہی تھی کہ تیرا بیٹا زندہ ہے

اور وہ ضرور ایک روز واپس آئے گا۔ گولا وارث موسی اب ورِدھ آشرم باسی بن چکی تھی پھر بھی ایک موہوم سی امید تھی کہ کم سے کم اس کا بیٹا اس کی موت کی خبر سن کر دوڑتا ہوا چلا آئے گا اور اس کی چِتا کو آگ لگائے گا۔ دوسری طرف اس کی بیٹی تھی جس کا شوہر روزگار کی تلاش میں شہر چلا گیا تھا اور اس کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔ وہاں ان کے بچے پیدا ہو گئے تھے۔ شادی کے بعد ابتدا میں بیٹی نے ماں کی خیر خبر لی تھی مگر بعد میں وہ بھی غائب ہو گئی اور اس کا اَتہ پتہ بہت کوشش کے باوجود موسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ موسی بے چاری ان پڑھ تھی، اس کے پاس رابطہ کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ کچھ سراغ ہی ملا جاتا یا کچھ اشارے ہی مل جاتے تو شاید موسی خود ہی وہاں پہنچ جاتی مگر اس کی بیٹی اور داماد نے کوئی نشان بھی نہیں چھوڑا۔ اس لیے اس محاذ پر بھی وہ مایوس ہو چکی تھی۔ اسے اب محسوس ہو رہا تھا کہ زندگی میں جتنے دن باقی بچ گئے ہیں انھیں آشرم ہی میں بِتائے کیونکہ اب وہ جسمانی طور پر معذور ہو چکی تھی، کچھ حد تک یادداشت کھو چکی تھی اور چلنے پھرنے کے قابل بھی نہیں رہی تھی۔

مہمان خصوصی کے سامنے وھیل چیئر میں بیٹھی ایک عورت کو لایا گیا اور اس نے مانسی موسی کے ہاتھ میں گلدستہ پیش کر کے اس کو آشرم میں داخل کر دیا۔ پاس ہی کھڑی سُچیتا راٹھور کی آنکھیں پانی ہو کر بہنے لگیں۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ وہی موسی ہے جس نے بیسیوں بچوں کو موت، غربت اور بے چارگی سے بچا کر اس کے سامنے کھڑا کیا اور ان کو وَردان اَناتھ آشرم میں داخل کرایا۔ آج وہی پھرتیلی، انسان دوست اور ذاتی مفادات کو قربان کرنے والی عورت لاچار وھیل چیئر میں دھنسی ہوئی ہے۔ انسانی وجود کی یہی ایک سچائی ہے جس کو ہم اکثر نظر انداز کرتے ہیں۔ لیکن موسی نے اس حقیقت کو اپنایا اور گلے سے لگایا اور خود ہی آشرم میں داخلہ لینے کے لیے سامنے آ گئی۔

اس کے بعد نو اور بے سہارا عورتیں اسٹیج پر آئیں یا پھر لائی گئیں اور ان سبھی کا سُچیتا راٹھور نے گلدستے سے سواگت کر کے آشرم میں داخل کر لیا۔ سُچیتا کو احساس تھا کہ یہ آشرم بچوں کے آشرم سے بہت مختلف ہے۔ یہاں کے مکین جسمانی و ذہنی طور پر معذور ہو چکے ہیں اس لیے

انھیں ذاتی پرداخت کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس آشرم میں داخل ہونے والوں کے لیے صرف بیس افراد کا نشانہ رکھا گیا اور کسی بھی صورت میں اس سے تجاوز نہیں کیا گیا۔ یہاں کا اسٹاف بہت ہی سمجھ داری سے چھان بین کر کے رکھا گیا۔ سُچیتا راٹھور کا وقت اب زیادہ تر اسی آشرم میں گزرتا تھا۔ بوڑھے بزرگوں کی رفع حاجت کرانا، نہلانا دھلانا، کھانا کھلانا حالانکہ اسٹاف کی ذمہ داری تھی مگر سُچیتا ذاتی طور پر اس کی نگرانی کرتی تھی۔ اس کے علاوہ ان کی مصروفیات، صبح اٹھ کر بھجن کیرتن کرنا، آپسی تعامل اور تفریح کا خاص خیال رکھنا بھی وہ خود ہی سنبھالتی تھی۔ کچھ ہی مہینوں میں آشرم میں داخل بزرگوں کا نشانہ پورا ہو گیا اور اس کے بعد داخلے بند کر دیے گئے۔ اب تو سُچیتا راٹھور کو وہاں کے مکین 'دیدی' کے بدلے 'بیٹی' کہہ کر پکارتے تھے اور وہ بھی فخریہ انداز میں کہتی کہ میرے اتنے سارے ماں باپ ہیں جن کی میں دیکھ بھال کرتی ہوں۔ بھاسکر تو ہمیشہ مدد کے لیے تیار رہتا اور وِدوشی اور میترئی بھی ہفتے کے اخیر میں چلی آتیں اور ماں کا ہاتھ بٹاتیں۔

اس طرح سُچیتا راٹھور کی آخری خواہش بھی پوری ہو گئی اور وہ من ہی من میں بھگوان کا شکریہ ادا کرتی۔

(۳۹)

عجیب اتفاق ہے کہ ہجر میں وقت کاٹنے سے بھی نہیں کٹتا ہے۔ لمحہ گھنٹہ بن جاتا ہے، گھنٹہ دن بن جاتا ہے اور دن سال کے برابر ہو جاتا ہے۔ مگر وصال کے بعد وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا ہے۔ لمحے، گھنٹے، دن اور سال کیسے گزر جاتے ہیں پتہ ہی نہیں چلتا۔ بھاسکر اور سُچیتا کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ جب وہ ایک دوسرے سے دور اپنی اپنی دنیا میں الگ جی رہے تھے، ان کو زندگی گزارنا دریائے شور عبور کرنے کے مترادف تھا۔ لیکن جب وہ دونوں ازدواجی بندھن میں بندھ گئے، وقت ان کے پاؤں تلے بے صوت وصدا گزرتا چلا

جارہا تھا۔ آنکھ جھپکتے ہی کئی برس بیت گئے۔

شادی ہوئے ان کو آج پانچ برس ہو گئے۔ شادی کے بعد دونوں روزانہ صبح کی سیر کے لیے بہت دور تک نکل جاتے ماسوائے جب بھاسکر بھوانی پور سے باہر ہوتا۔ اس دن سُچیتا اکیلے ہی مارننگ واک پر چلی جاتی۔ آج بھاسکر ہی پہلے جاگا اور اس نے فوراً سُچیتا کی ملائم گال پر پیار بھرا بوسہ دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بول اُٹھا۔ ''شادی کی سالگرہ مبارک ہو''۔ سُچیتا بھی جاگنے کی تیاری کر رہی تھی اور بستر میں کروٹیں بدل رہی تھی حالانکہ اس کی آنکھیں ابھی تک بند تھیں۔ گال پر بھاسکر کے لبوں کا لمس محسوس کر کے وہ چونک گئی، آنکھیں میچ لیں اور پھر نیم وا آنکھوں سے جواب دیا۔ ''بھاسکر، تمھیں بھی شادی کی سالگرہ مبارک ہو۔ تمھارا یہ نیا سال اچھا اور خوشیوں بھرا گزرے۔'' پھر وہ بستر سے کود کر اٹھ کھڑی ہوئی اور جلدی سے تیار ہو کر چائے کی دو پیالیاں بنالائی۔ چائے پینے کے فوراً بعد دونوں حسب معمول صبح کی سیر کے لیے گھر سے نکل پڑے۔ ہر روز وہ قریباً پانچ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے لوٹ آتے۔

قدم برائے مکالمہ اٹھ رہے تھے کہ سُچیتا نے مکالمے کا آغاز کیا: ''بھاسکر، میں نے بہت سارے دکھوں کا سامنا کیا، پیار ہوا تو اس کی منظوری نہیں ملی، شادی ہوئی تو جہیز نہیں دے پائی اور برات ڈیوڑھی سے واپس چلی گئی، پھر پاپا کا ہارٹ اٹیک ہو گیا اور اس کے ترت بعد میری ممی بھی مجھ کو اکیلی چھوڑ کر چلی گئی، میں اکیلی پڑ گئی بالکل اکیلی، دائیں بائیں کوئی سہارا نہیں دکھائی دیا۔ کئی روز ذہنی دباؤ میں مبتلا رہی۔ پھر نہ جانے کہاں سے ایک آواز سی سنائی دی ''نہیں سُچیتا تم اس حالت میں زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتی، اٹھو اور کمر کس لو، تم دنیا میں کچھ حاصل کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہو۔'' وہ لمحہ مجھے نئی زندگی بخش گیا۔ مجرد ماں بن گئی، یتیم خانہ کھول دیا، پھر اسکول کھول دیا، گاؤں میں تین سال لگاتار قحط پڑ گئی، گاؤں والوں کو قحط سے لڑنے کا حوصلہ عطا کیا، پھر تمھاری مدد سے اولڈ ایج ہوم کھڑا کر دیا۔ اب مجھے زندگی سے کوئی گلہ نہیں، کوئی شکوہ نہیں۔''

''ہاں سچ کہہ رہی ہو سچی، میں تمھاری اسی انرجی کا قائل ہوں۔ تم نے کہاں سے اتنی ساری قوت اکٹھا کی میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ گو میں تم سے الگ رہا مگر میری نظر سے تم کبھی

بھی اوجھل نہیں رہی۔ تمھارے ہر قدم کے ساتھ میری غیبی ہم جلیسی رہی۔ اور مجھے خوشی ہے کہ تم نے یہ سب کچھ پالیا۔''

''ہاں بھاسکر، مجھے اب یہ چنتا کھائے جا رہی ہے کہ میں نے اتنا سارا جال تو پھیلایا مگر میرے بعد اس کا کیا ہوگا؟ اس کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ میں نے کبھی اس بارے میں سوچا ہی نہیں۔ کبھی کسی کو تربیت بھی نہیں دی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میں امر ہوں اور یہ سنستھائیں میں انت کال تک چلاتی رہوں گی۔''

''سچی، تم ان چیزوں کی فکر کرنا چھوڑ دو۔ لوگ آتے ہیں جاتے ہیں اور زندگی کا کارواں چلتا رہتا ہے، کبھی کسی کے مرنے سے رکتا نہیں۔ مجھے یاد ہے جن دنوں پنڈت جواہر لال نہرو ملک کے وزیر اعظم تھے تو لوگ اس بات پر پریشان تھے کہ نہرو کے بعد کون؟ کتابیں لکھی گئیں۔ اور جب وہ اچانک مر گیا، ایک ایسا آدمی چنا گیا جس کو نہرو نے کامراج پلان کے تحت کئی مہینے قبل اپنے کابینہ سے نکال دیا تھا۔ اس کو چُننے والے یہ سوچ رہے تھے کہ نہرو کی شخصیت کے برخلاف وہ شریف الذات اور غربت میں پلا بڑھا ہے اس لیے ہماری بات مانا کرے گا۔ انہی دنوں پاکستان کے ساتھ جنگ ہوئی اور شاستری جی نے اپنی شخصیت کا وہ روپ دکھایا جو آج تک کوئی اور وزیر اعظم نہیں دکھا پایا۔ اس چھوٹی سی کایا میں کتنی شکتی تھی وہ اس مختصر سے دور میں معلوم ہوا جب لال بہادر شاستری ملک کا وزیر اعظم تھا۔ اچانک انتقال کے باوجود لوگ اس کی دلیری اور رہنمائی کی آج بھی داد دیتے ہیں۔ اس کے بعد اندرا گاندھی آئی جس نے ملک کو نئی دِشا دی اور بنگلہ دیش کو آزاد کرا کے ایک نئی تاریخ رقم کی۔ میری پیاری، یہ دنیا ایک سلسلہ وار ڈرامہ ہے جس میں وقتاً فوقتاً کردار بدل جاتے ہیں مگر ڈرامے کا انت کبھی نہیں ہوتا۔''

''ہاں بھاسکر تم صحیح کہتے ہو۔ میری یہ پریشانی انسانی کمزوری کا نتیجہ ہے۔ وقت سب سے بڑا معالج ہے۔ ویسے تو میں نے ایریا کی ترقی کے لیے کواپریٹو بنا رکھا ہے اور اس کے ارکان باضابطہ انتخابات کے ذریعے گورننگ کونسل چنتے ہیں اور وہی فیصلہ لیتے رہتے ہیں۔ تاہم میں

چاہتی ہوں کہ جلدی سے وہاں سے سبکدوش ہوکر اپنے جانشین کو چننے میں ان کی مدد کرلوں۔''

''یہ ٹھیک رہے گا۔اپنے سامنے ہی یہ کام ہو جائے تو بہتر ہے اور تمھارے ہوتے ہوئے ایک اچھا ذمہ دار شخص اس کواپریٹو کا ہیڈ بن جائے تو سونے پر سہاگا ہوگا کیونکہ تمھیں اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی قابلیت کا خوب اندازہ ہے۔''

''اب سوال ہے اَناتھ آشرم، اسکول اور حال ہی میں کھولے گئے ورِدھ آشرم کا، ان کے بارے میں سوچ بچار کرنا پڑے گا۔ان کاموں کو سنبھالنے کے لیے بےلوث اور مخلص آدمیوں کی ضرورت ہے۔خیر ابھی تو وقت ہے، دیکھتی ہوں کیا کر سکتی ہوں۔''

''مجھے اس حوالے سے کوئی چنتا نہیں ہے۔میرا جانشین تو میرا پیارا بھائی رنبیر چوہان ہی بنے گا۔یہ تو میں نے کب کا طے کرلیا ہے۔''

''اوہ، تم تو گریٹ ہو۔'' سُچیتا اس کے چہرے کو تکتی رہ گئی۔

مکالمے کے دوران وہ واپس مڑ گئے اور آہستہ آہستہ اپنے کاشانے تک پہنچ گئے۔

(۴۰)

وِدوشی اپنے کام سے مطمئن نہیں تھی۔ایک روز ڈائننگ ٹیبل پر اپنے شوہر رنبیر سے مخاطب ہوئی۔''رنبیر، میں اپنا پیشہ بدلنا چاہتی ہوں، میں اس پیشے سے بالکل خوش نہیں ہوں۔''

رنبیر کو حیرت ہوئی کہ ایک کامیاب وکیل جس کی سارے شہر میں توتی بول رہا ہے، وہ اپنے پیشے کو ترک کرنا چاہتی ہے۔آخر کچھ تو ہوگا جس کے سبب وہ اسے چھوڑنا چاہتی ہے۔اس لیے پوچھ بیٹھا۔''ڈارلنگ کیا بات ہے، آج کچھ اُکھڑی اُکھڑی باتیں کر رہی ہو؟''

''یوں ہی من میں خیال آیا۔بہت دنوں سے سوچ رہی تھی کہ اس پیشے میں کیا رکھا ہے، جھوٹ کی عمارتیں کھڑی کرنا، نیرنگ کے پیچ چلانا، مکر و فریب کی بساط بچھانا، سچ کو جھوٹے

گواہوں اوران کی جھوٹی شہادتوں سے کذب ثابت کرنااور کچھ نہیں۔ بھاسکر میں سوچ رہی ہوں کہ ممی کی عمراب کافی ہوگئی ہے اوراب اس میں وہ سکت نہیں رہی ہے کہ وہ اپنے اسکول کی دیکھ بھال کر سکے۔ اس لیے کیوں نہ میں استعفیٰ دے کراس کے اسکول کا انتظام سنبھالوں۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کے اسکول کی توسیع کروں، ساتھ میں ایک کالج بنوادوں اورلڑکیوں و لڑکوں کے لیے الگ الگ ہوسٹل بنوادوں۔ اس کے علاوہ میں اس اسکول کی شاخیں دیگر قصبوں میں بھی کھولنا چاہتی ہوں۔ سوچا تم کو اپنے خیال سے آگاہ کرلوں۔''

''یہ تو بہت اچھا رہے گا۔ پھر تو میں بھی اپنا تبادلہ بھوانی پور ہی کراؤں گا۔ وہاں تو ہمارا ہیڈ کوارٹر ہے۔ پھر دونوں وہیں پر رہ سکتے ہیں۔ تمھیں کبھی میری ضرورت پڑے تو میں حاضر ہوجاؤں گا۔''

''رنبیر، تم کتنے سویٹ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے تم سے پیار ہوگیا۔ تم نہیں جانتے کہ میں تمھاری کتنی عزت کرتی ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے کہنے کی دیر ہوگی کہ تم اپنی خوشی کا اظہار کرلوگے۔ تھینک یو، ڈیر۔''

دوسرے روز دونوں بھوانی پور پہنچ گئے اور سُچیتا کو اپنے آنے کی غرض سے مطلع کیا۔ سُچیتا کو حیرانی ہوئی۔ کہاں تو وہ اس بات پر پریشان تھی کہ میرے بعد میرے بنائے ہوئے مختلف اداروں کا کیا ہوگا اور کہاں تو آسماں سے ٹپکی یہ نعمت! اس نے خواب وخیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وِدوشی اپنا اچھا بھلا پیشہ چھوڑ کر اسکول کا انتظام کرنے کے لیے رضا کارانہ طور پر سامنے آئے گی۔ اس نے اپنے بازو میں چٹکی لی تا کہ دیکھ سکے کہ یہ حقیقت ہے یا کوئی خواب۔ جب اطمینان ہوا تو اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

باتوں باتوں میں وِدوشی نے اپنی ماں کو اسکول کے بارے میں کاغذ پر نقشۂ راہ بنا کر سمجھایا۔ سُچیتا من ہی من میں مسرت محسوس کرنے لگی مگر باہر سے سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ کر بیٹھی۔

''بیٹی، اس سنستھا میں صرف اسکول ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ جڑا ہوا یتیم خانہ بھی ہے اوراب یہ بزرگ خانہ بھی شامل ہوگیا ہے۔''

''ممی ان کے بارے میں فی الحال میں نے سوچا نہیں ہے مگر ان کا بھی کوئی نہ کوئی حل ضرور نکل آئے گا۔ آپ پہلے اسکول کے بارے میں اپنی منظوری دے دو، پھر ان کے بارے میں بھی میں سوچ لوں گی۔ اس وقت میں ایسی کوئی ذمے داری نہیں لینا چاہتی جو میں بعد میں نباہ نہیں سکتی۔ اس بارے میں میں رنبیر سے مشورہ کرلوں گی اور بعد میں فیصلہ لوں گی۔''

''بیٹی، مجھے تمھارے اسکول کا انتظامیہ سنبھالنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے، تم جب چاہو اس کام کو سنبھال سکتی ہو۔ میں بھی اب کتنے دن جیوں گی، جلدی سے میرے کندھوں سے یہ بوجھ اتر جائے تو بہتر ہے۔''

کچھ روز کے بعد ہی وِدوشی اور رنبیر بھوانی پور منتقل ہوگئے۔ رنبیر نے بھاسکر کی رضامندی سے کمپنی کے بھوانی پور ہیڈ کوارٹر میں جوائن کرلیا اور وِدوشی نے باضابطہ سیکنڈری اسکول کی کمان سنبھالی۔ دو تین سالوں میں ہی اسکول کا نقشہ بدل گیا۔ غیر مقامی لڑکیوں کے لیے تو ہوسٹل تھا ہی، اس کے علاوہ لڑکوں کے لیے بھی ہوسٹل بنایا گیا۔ ساتھ میں سرکار سے اجازت لے کر کالج کی بنیاد بھی ڈالی گئی۔ اُدھر کچھ بھولے بسرے علاقوں میں بھی اسکول کی شاخیں کھولی گئیں اور اس طرح بھوانی اسکولوں کا ایک جال سا بچھا دیا گیا۔ ان اسکولوں میں قابل پیشہ ور اساتذہ اور ہیڈ ماسٹروں کی تقرری کی گئی جو وہاں کا انتظامیہ براہ راست سنبھالنے لگے جبکہ رہنمائی کے لیے وہ وِدوشی کے پاس حاضری دیتے تھے۔ وِدوشی سبھی شاخوں پر نظر رکھتی تھی اور گاہے بہ گاہے ان کا دورہ بھی کرتی تھی۔

(۴۱)

دراصل دونوں بیٹیوں کو ماں کی طرز زندگی نے بہت متاثر کیا تھا۔ سُچیتا راٹھور کے نصب العین، استعداد، اکتسابِ عمل اور جذبۂ خدمتِ خلق کا چرچا ہر طرف تھا جبکہ وہ خود بے لوث و بے غرض جادۂ حیات پر گامزن تھی، نہ کسی انعام و اکرام کی خواہش تھی اور نہ ہی کسی سرکاری اعزاز

کی۔ انہی آدرشوں نے بیٹیوں کا من موہ لیا تھا۔ انھوں نے اس مادیت پسند دور میں لوگوں کو تحصیل زر کے لیے لڑتے مرتے دیکھا تھا، رشتوں کی ڈور کو پل بھر میں توڑتے ہوئے دیکھا تھا، الٹے سیدھے کام کر کے بڑے بڑے عالیشان مکان کھڑے کرتے ہوئے دیکھا تھا، دولت اکٹھا کرنے کے لیے دلالی، منشیات کی تجارت اور کبوتر بازی کرتے دیکھا تھا مگر انھوں نے اپنی ماں کی کہیں نظیر نہیں دیکھی تھی، ماں کی طرح اپنی زندگی کو انسانی بہبود کے لیے وقف کرتے نہیں دیکھا تھا، لاولد بچوں کو سہارا دینے والی ممتا کو نہیں دیکھا تھا اور سب سے بڑی بات ایک ریگستان کو گلشن میں تبدیل ہوتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ان کی سوچ وفکر پر بھی سُچیتا کا سایہ پڑا ہوا تھا اور وہ بھی اپنی ماں کے نقش قدم پر چلنا چاہتی تھیں۔ اپنی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھا کر وہ بھی اپنے دیش واسیوں کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھیں۔ وِدوشی نے اسکول کے انتظامیہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کی توسیع ونشو ونما کے منصوبے بناتی رہی جس میں رنبیر نے بھی اس کی بہت مدد کی۔

اُدھر میترئی اور پنکج نے بھی ایک بہت بڑا فیصلہ لے لیا۔ وہ بھوانی پور میں ایک اسپتال کھولنا چاہتے تھے تاکہ نظر انداز کیے گئے اس علاقے کے عوام کو علاج معالجے کی بنیادی سہولتیں میسر ہو سکیں۔ سرکار کی جانب سے گذشتہ کئی دہائیوں کے دوران اس طرف کبھی دھیان ہی نہیں دیا گیا تھا۔ میاں بیوی نے فیصلہ لیا اور اس پر عمل کرنے کے لیے کمر کس لی۔ سب سے پہلا کام تھا سُچیتا اور بھاسکر سے صلاح مشورہ کرنے کا کیونکہ ان دونوں کے پاس تجربہ تھا اور وہ اس کام میں کافی مدد کر سکتے تھے۔

سُچیتا کو ان کی تجویز پر تعجب ہوا۔ وہ سوچنے لگی کہ کہاں تو وہ پریشان تھی کہ اس کے بعد اس کی سنستھا کا کیا ہوگا۔ اس نے بیٹیوں کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اور کہاں دونوں بیٹیاں بنا بلائے آدھمکی اور دونوں نے بھوانی پور کو ہی اپنا مستقر بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ تاہم اس کے دل میں ایک وسوسہ پیدا ہوا کہ بھلی چنگی نوکری کو لات مار کر ایک ایسے میدان میں کودنا جس کے نفع نقصان کے بارے میں کوئی جانکاری نہ ہو، کیا صحیح قدم ہوگا؟ تاہم وہ دونوں کا دل دکھانا

نہیں چاہتی تھی۔ بھاسکر بھی وہیں صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔اس نے ان کا حوصلہ بڑھایا اور یقین دلایا کہ اگر کہیں اس کی ضرورت پڑے تو وہ حاضر ہے۔اس نے سرمایہ کاری کرنے کا بھی بھروسہ دلایا۔اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔سرمائے کی بات سن کر پنکج اور میترئی دونوں دل ہی دل میں خوش ہوگئے۔انھیں تو بن مانگے ہی موتی مل گئے۔سُچیتا نے بھی ان کی مدد کی۔کہا کہ وہ بھوانی پور میں کچھ لوگوں سے بات کرلے گی جن کے پاس بے کاشت زمینیں پڑی ہوئی ہیں، وہ اسپتال کے لیے خرید لیں گے مگر وہ آبادی سے دور نہیں ہونی چاہیے۔اس طرح سبھی تگ ودو میں منہمک ہوگئے۔پنکج اور میترئی اسپتال کے لیے سرکار سے جو بھی اجازت نامے تھے وہ حاصل کرنے میں لگ گئے۔

سرکار نے تو ان کے اس قدم کا خیر مقدم کیا۔اب تو سرکار کی سوچ بھی بدلی ہوئی تھی۔وہ ہر چیز میں اپنا ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتی تھی اس لیے پرائیویٹ سیکٹر کی حوصلہ افزائی کرتی تھی۔ فراموش زدہ اس علاقے میں اگر چہ سُچیتا اور گاؤں والوں نے مل کر کئی برس محنت کرکے انقلاب لایا تھا مگر ابھی بھی چند ایسے گوشے تھے جہاں توجہ دینے کی ضرورت تھی۔ان میں سے حفظانِ صحت بھی ایک گوشہ تھا۔زمین کی خریداری مکمل ہوتے ہی سرکار کی منظوریاں ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔بنکوں سے بھی معقول قرضہ مل گیا اور آرکیٹیکٹ کے نقشے پر غور کرکے اس کو عمل میں لانے کے لیے پنکج نے رات دن ایک کرلیے۔کہتے ہیں جہاں چاہ وہاں راہ۔دو سال میں عمارت کھڑی ہوگئی۔موڈرن اوزار اور مشینیں منگوا کر نصب کی گئی۔ڈاکٹروں اور پیرامیڈیکل اسٹاف کی بھرتی کی گئی۔ابتدا میں شہر سے وزیٹنگ ڈاکٹر ہفتے میں ایک دو بار آتے تھے جب تک اسپتال کی ساکھ بڑھ گئی اور پھر یہ علاقے کا مشہور اسپتال بن گیا۔یہ کامیابی میترئی اور پنکج کی ان تھک محنت ومشقت کا ثمر تھی اور انھیں اپنے فیصلے پر اطمینان تھا۔بھاسکر اور سُچیتا نے بھی اس پروجیکٹ کو کامیاب بنانے میں بہت یوگدان دے دیا۔

بھاسکر نے بھی اپنی کمپنیوں کا انتظام رنبیر چوہان کو سونپ دیا، جس کی تصدیق بورڈ آف ڈائریکٹرس نے یکسوئی سے کرلی۔ تاہم وہ ٹرسٹ کا چیئرمین بنا رہا اور اپنی رہبری سے رنبیر کو مستفید کرتا رہا۔ سوال صرف یتیم خانہ اور بزرگ خانہ کا تھا جس کے انتظام کا کچھ حل نہیں نکل پا رہا تھا۔ وَردان اَناتھ آشرم میں پلی بڑھی اور اسکول سے فارغ ہوئی ایک طالبہ، جس نے سوشل سائنسز میں پوسٹ گریجویشن کرلی تھی، ایک روز سُچیتا سے ملنے آئی اور اس نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ اس کے ساتھ اس کی سہیلی بھی تھی۔ وہ بھی اسی وَردان اَناتھ آشرم کی پیداوار تھی اور اس نے گریجویشن تک پڑھائی کی تھی۔ دونوں چاہتی تھیں کہ وہ یتیم خانہ اور بزرگ خانہ کی دیکھ ریکھ کے لیے اپنی زندگی وقف کرلیں کیونکہ وہ خود یتیم لڑکیاں تھیں اور انھیں اس بات کا احساس تھا کہ اگر یہ یتیم خانہ نہ ہوتا تو وہ راستے پر نہ جانے کہاں بھیک مانگ رہی ہوتیں یا پھر کسی کوٹھے پر ناچ رہی ہوتیں۔ وہ اس سنستھا کو ختم ہوتے نہیں دیکھنا چاہتی تھیں۔ انھیں پتہ چلا تھا کہ اب سُچیتا میڈم عمر کے اس پائیدان پر پہنچ چکی ہے جہاں اسے یہ کام سنبھلتا نہیں تھا اور اسی لیے اس نے اسکول اپنی بیٹی کے حوالے کردیا تھا۔ چنانچہ یتیم خانہ اور بزرگ خانہ چلانے میں بے لوث اور بغیر لالچ کے کام کرنے کی ضرورت تھی اور اس بات کی چنتا کرنے کی ضرورت نہ تھی کہ اس کام سے انھیں کیا فائدہ ملے گا، وہ دونوں سوچ سمجھ کر میدان میں کود پڑیں اور رضا کارانہ طور پر یہ کام سنبھالنے کے لیے تیار ہوگئیں۔ بہرحال سُچیتا نے انھیں نہ ہاں اور نہ ناں کہہ دی بلکہ اس پر سوچنے کے لیے وقت مانگا۔ اس نے انھیں دو تین دن کے بعد بلایا۔ وہ بھاسکر سے اس مسئلے پر بات کرنا چاہتی تھی۔

اسی رات سُچیتا ڈائننگ ٹیبل پر اس بارے میں بھاسکر سے مخاطب ہوئی:

''آج دوپہر بعد دو لڑکیاں، جو وَردان اَناتھ آشرم میں ہی پلی بڑھی ہیں اور اب تعلیم مکمل کرچکی ہیں، میرے پاس آئیں اور کہنے لگیں کہ انھوں نے سماج سیوا کرنے کا فیصلہ کیا

ہے۔ وہ چاہتی ہیں کہ انھیں وَردان اَناتھ آشرم اور وَردان ورِدھ آشرم کے ساتھ منسلک ہونے کا موقع دیا جائے تا کہ وہ یہ کام ہمیشہ کے لیے اپنے ذمہ لے سکیں۔''

''سُچی، کیا تم سچ کہہ رہی ہو یا مذاق کر رہی ہو؟''

''اس میں مذاق کرنے والی کونسی بات ہے بھاسکر۔ تمھیں کیا لگتا ہے کہ میں ایسے سنجیدہ مسئلے پر دل لگی کرلوں گی!''

''نہیں، میں نے یوں ہی قیاس لگایا کہ تم بہت دنوں سے اس بارے میں پریشان تھیں اور بھگوان نے اچانک کہاں آسمان سے فرشتے بھیج دیے۔''

''یہ سچ ہے۔لگتا ہے بھگوان بھی مخلص بندوں کی حمایت کرنے میں ہمیشہ تیار رہتا ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ یہ کوئی ذاتی مسئلہ نہیں ہے بلکہ ان دواداروں پر کئی جانیں منحصر ہیں، ایک طرف یتیم بچے اور دوسری طرف بوڑھے نادار لوگ۔''

''تم نے کیا جواب دیا؟''

''میں نے کہا کہ میں اس بات پر غور کروں گی اور انھیں دو تین روز کے بعد بلایا۔ میرا ارادہ تھا کہ پہلے تم سے مشورہ کرلوں، اگر تم اس پیش کش کو مناسب سمجھو تو تبھی میں ان کو ہاں کہہ دوں گی۔''

''ایسا کرلو تم انھیں ان اداروں کے ساتھ جوڑ دو اور ان کو دو چار مہینے کام سیکھنے کو کہو تا کہ وہ اپنی ذمہ داریاں سمجھ سکیں۔ اگر اس کے بعد انھیں یہ ذمہ داری سنبھالنے کی خواہش ہو گی تو پھر ان کو ہم یہ دونوں ادارے سونپ سکتے ہیں۔ بہر حال جب تک تم زندہ ہو اور کام کرنے کے قابل ہو تم ان دونوں اداروں کے ساتھ منسلک رہو گی اور اپنا یوگدان دیتی رہو گی۔''

''یہ نیک صلاح ہے۔ جب تک میرے ہاتھ پاؤں کام کرتے ہیں، میری آنکھیں سلامت ہیں اور صحت برقرار ہے تب تک میں ان دونوں اداروں کی دیکھ ریکھ خود ہی کروں گی۔ اس کے بعد ان کے انتظام کے لیے دو رضا کار شخصیتیں تیار ہوں گی۔''

تین روز کے بعد دونوں لڑکیاں سُچیتا راٹھور کے دفتر میں حاضر ہوئیں اور اسے ماں کہہ کر

مخاطب ہوئیں۔ ''ماں، کیا سوچا اس بارے میں، ہم تو آپ کے فیصلے کا انتظار کر رہی ہیں۔''

''ٹھیک ہے، مجھے تمھاری تجویز پسند ہے۔ تم دونوں تین مہینوں کے لیے ان دونوں اداروں کے ساتھ جڑ جاؤ اور کام سیکھ لو۔ تمھیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس بھی ہوگا اور تجربہ بھی۔ اس کے بعد اگر تمھیں محسوس ہوگا کہ تم یہ بار اٹھا سکوگی تو میں تمھیں ان کے انتظامیہ سے جوڑ دوں گی۔ فی الحال میں ان دونوں اداروں سے منسلک رہوں گی اور اس کے بعد تم دونوں اس کے منتظم بن جاؤ گی اور میں تاعمر ان اداروں کی سربراہ رہوں گی۔ اس کے بارے میں میں کاغذات تیار کراؤں گی۔''

''جیسے آپ مناسب سمجھیں۔ آپ تو ہماری ماں سمان ہیں۔ ہمارا وجود تو آپ کا قرض دار ہے۔ خدمت خلق کا درس تو ہم نے آپ کی زندگی سے ہی پایا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ آپ سو برس جیتے رہیں اور ہماری رہبری کرتے رہیں۔ اچھا تو ہم اگلے سوموار کو حاضر ہو جائیں گے۔''

''جیتی رہو۔ میں انتظار کروں گی۔''

تین مہینے تک دونوں سہیلیاں سُچیتا کے ساتھ جڑی رہیں اور پورا کام سیکھ لیا۔ من ہی من میں بہت خوش ہوئیں کہ جو چاہا وہ بخوبی ہو گیا اور اب وہ خود کو دونوں اداروں کا انتظام سنبھالنے کے لائق سمجھنے لگیں۔ اپنی زندگی میں ضرورت مند انسانوں کی خدمت کرنا، اس سے بڑھ کر اور کیا کام ہو سکتا ہے۔ انھیں اس کام کو کرنے میں اپنی زندگی کی معراج نظر آ رہی تھی۔ ان کا ماننا تھا کہ بھگوان کو پانے کا یہ بہترین راستہ ہے۔ سُچیتا راٹھور بھی مطمئن ہوئی اور آہستہ آہستہ اس نے ان اداروں کا بار ان دو جوان کندھوں پر ڈال دیا۔

سُچیتا راٹھور نے وِدوشی سے صلاح مشورہ کر کے دونوں اداروں کا انتظام ان دو رضا کاروں کو سونپنے کے لیے کاغذی کارروائی مکمل کی جبکہ خود اداروں کی سربراہ بنی رہی۔ دونوں نوخیز منتظمین کو بہت خوشی ہوئی اور انھوں نے اپنی ماں سمان سُچیتا راٹھور کا شکریہ ادا کیا۔

ہندواور جین دھرم کی تاریخ میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں جہاں لاتعناہی دولت کے مالک اپنی کروڑوں کی ملکیت سے دست بردار ہوکر سنیاس کی راہ پکڑتے ہیں۔ یہاں بھی بھاسکر اور سُچیتا نے جیتے جی ایک بڑے تیاگ کا اعلان کر دیا کہ وہ اپنی ساری ملکیت سے دست بردار ہوگئے اور اس سے نئی نسل کے حوالے کر دیا جو ہندو دھرم کے عین مطابق ہے۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد انھیں یک گونہ اطمینان ہوا اور یوں محسوس ہوا کہ ان کے کندھوں سے ایک بہت بڑا ابار اتر گیا ہے اور اب وہ باقی ماندہ زندگی اپنے نام کر سکتے ہیں۔ دیکھا جائے تو ان کی اس کارروائی میں تیاگ تھا مگر سنیاس اپنانے کا کوئی ارادہ نہ تھا کیونکہ ان کی زندگی ہی ایک بہت بڑا تیاگ تھی اور وہ ایک سنیاسی کی طرح ہی اپنا جیون بِتا رہے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اخیر میں ان دونوں، عاشق و معشوق، کا ملن ممکن ہو پایا جو شاید خدا کی ان پر مہربانی تھی۔

کچھ دنوں کے بعد گھر کے سبھی لوگوں وِدوشی اور رنبیر، میترئی اور پنکج نے اکٹھے مل کر صبح سویرے دونوں بھاسکر اور سُچیتا کو نیند سے جگایا اور خوبصورت گلدستوں سے تہنیت پیش کی۔ ساتھ ہی 'ہیپی میرج اینیورسری' کے نعرے کمرے میں گونجنے لگے۔ رات کو گھر پر ہی ڈنر کا اہتمام کیا گیا جس میں گھر کے لوگ اور قریبی رشتے دار تو تھے ہی ان کے علاوہ زبیدہ اور سنستھاؤں کے نئے منتظمین کو مدعو کیا گیا۔ بہت دیر تک پارٹی چلتی رہی۔ خوب ہنگامہ برپا رہا۔ آخر میں وِدوشی نے کھڑے ہوکر بھاسکر اور سُچیتا کو ایک انمول گفٹ دینے کا اعلان کر دیا۔ رنبیر نے جلدی سے گفٹ لایا جو بہت ہی چھوٹے سائز کا تھا اور بھاسکر کے ہاتھ میں تھما دیا۔ سُچیتا اپنے تجسس کو چھپا نہ سکی اور بھاسکر سے گفٹ لے کر اس کی ریپنگ اتارنے لگی۔ تحفے کی نقاب کشائی کے بعد ہر طرف تالیاں بجنے لگیں۔ اندر سے تھامس کک کی ایک مہینے کی ٹور پیکیج کی دو ٹکٹیں برآمد ہوئیں جو بھاسکر اور سُچیتا کے لیے خلیجی اور یوروپی ممالک کی سیر کرنے کے لیے تھیں۔ بھاسکر اور سُچیتا بچوں کی اس جذباتی حرکت سے پھولے نہ سمائے۔ دونوں سوچنے

لگے کہ شاید بطن سے پیدا ہوئی اولاد بھی آج کل کے زمانے میں اتنے پیار ومحبت کا اظہار نہ کرتی جتنی وِدوشی اور میترئی کر رہی ہے۔ انھوں نے دل ہی دل میں دونوں بچوں کے لیے لمبی عمر اور خیریت کی دعا مانگی۔ انھیں زندگی سے کوئی شکوہ گلہ نہیں رہا تھا، نہ ہجر کا اور نہ وصل کا، نہ دھن دولت کی کمی کا اور نہ سُکھ سویدھاؤں کے ابھاؤ کا، نہ تنہائی کا اور نہ سماج کی بے اعتنائی کا۔ انھیں بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ انھوں نے اپنی زندگی کا مشن پورا کیا اور اس میں بھگوان نے ان کی مدد کی اور وہ کامیاب ہوئے۔

اس کے بعد وہ امید فردا کے خواب آنکھوں میں بسائے، سب کو شب بخیر کہہ کر اپنے بیڈ روم کی جانب چلے گئے۔

☆☆☆

نام : دیپک کمار بُدکی

قلمی نام : دیپک بُدکی

پیدائش : ۱۵/فروری ۱۹۵۰ء بمقام سرینگر، جموں وکشمیر

ایڈریس : 102-اے، ایس جی امپریشن، سیکٹر۴-بی، وسُندھرا، غازی آباد201012

ای میل : deepak.budki@gmail.com موبائیل: 9868271199

تعلیم : ایم ایس سی، بی ایڈ: ایسوسی ایٹ، انشورنس انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا، این ڈی سی

پیشہ: ریٹائرڈ ممبر، پوسٹل سروسز بورڈ، نئی دہلی؛ ۹ سال آرمی پوسٹل سروس (لیفٹنٹ کرنل)

کارنامے : تقریباً ۱۶۰ افسانے، ۱۷۰ افسانچے، ۲۸۰ تبصرے اور ۷۵ تنقیدی وتحقیقی مضامین قلمبند؛ افسانے ہندی، تیلگو، مراٹھی، بنگالی، کشمیری، پہاڑی اور انگریزی میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ دو ترجمہ شدہ کتابیں ہندی میں اور ایک انتخاب انگریزی میں شائع ہو چکا ہے۔ ۳/افسانے انگریزی/بنگالی کی اینتھالوجیوں میں شامل کیے گئے ہیں۔ ایک کہانی دوردرشن کشمیر پر ٹیلی وائز ہوئی اور کئی کہانیاں آل انڈیا ریڈیو اردو سروس اور کشمیر سے نشر ہوئی ہیں۔

تصانیف : (افسانے): ادھورے چہرے، چنار کے پنجے، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی، ریزہ ریزہ حیات، روح کا کرب، اب میں وہاں نہیں رہتا، جڑوں کی تلاش، پتوں پر لکھی تحریریں؛ (افسانچے): مٹھی بھر ریت، یہ کیسا رشتہ؛ (سوانح عمری): لوحِ حیات؛ (مضامین وتبصرے): عصری تحریریں، عصری شعور، عصری تقاضے، عصری تناظر، عصری نقوش، ادبی مباحث، جموں وکشمیر کا عصری ادب، عصری زاویے، عصری رجحانات، عصری تخلیقات؛ (تحقیق): اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار، کرشن چندر-میری نظر میں (ناول): اپنا اپنا سچ، آزادی، سیندور کی سوگندھ

مقالہ Genesis of Kashmir Problem & Article 370:(for ndc)

خصوصی نمبر: 'انتساب عالمی'، سرونج (دیپک بُدکی نمبر)، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۶ء

گوشے : 'شاعر ممبئی' ستمبر ۲۰۰۴ء، 'انتساب' سرونج ۲۰۰۶ء، 'اسباق' پونے جولائی ۲۰۰۷ء،

سہ ماہی 'عالمی میراث' پونے ۲۰۲۰ء

انعامات : راشٹریہ گورو سمان (انٹرنیشنل فرینڈشپ سوسائٹی) ۲۰۰۹ء؛

ڈاکٹر منظر کاظمی ایوارڈ برائے فکشن ۲۰۱۹ (چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی)

M. R. Publications

Printers, Publishers, Suppliers & Distributors of Literary Books

10 Metropole Market, 2724-25 First Floor

Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002

Cell: 09810784549, 09873156910 E-mail: abdus26@hotmail.com

ISBN 93-6058-558-0

نام : دیپک کمار بُدکی

قلمی نام : دیپک بُدکی

پیدائش : ۱۵؍فروری ۱۹۵۰ء، بمقام سرینگر، جموں وکشمیر

ایڈریس : 102-اے، ایس جی امپریشن، سیکٹر ۴-بی، وسُندھرا، غازی آباد-201012

ای میل : deepak.budki@gmail.com **موبائیل**: 9868271199

تعلیم : ایم ایس سی، بی ایڈ؛ ایسوسی ایٹ، انشورنس انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا، این ڈی سی

پیشہ: ریٹائرڈ ممبر، پوسٹل سروسز بورڈ، نئی دہلی؛ ۹ سال آرمی پوسٹل سروس (لیفٹننٹ کرنل)

کارنامے : تقریباً ۱۶۰ افسانے، ۱۷۰ افسانچے، ۲۸۰ تبصرے اور ۷۵ تنقیدی و تحقیقی مضامین قلمبند؛ افسانے ہندی، تیلگو، مراٹھی، بنگالی، کشمیری، پہاڑی اور انگریزی میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ دو ترجمہ شدہ کتابیں ہندی میں اور ایک انتخاب انگریزی میں شائع ہو چکا ہے۔ ۳؍افسانے انگریزی/ بنگالی کی اینتھالوجیوں میں شامل کیے گئے ہیں۔ ایک کہانی دوردرشن کشمیر پر ٹیلی وائز ہوئی اور کئی کہانیاں آل انڈیا ریڈیو اردو سروس اور کشمیر سے نشر ہوئی ہیں۔

تصانیف : (افسانے): ادھورے چہرے، چنار کے پنجے، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی، ریزہ ریزہ حیات، روح کا کرب، اب میں وہاں نہیں رہتا، جڑوں کی تلاش، پتوں پر لکھی تحریریں؛ (افسانچے): مٹھی بھر ریت، یہ کیسا رشتہ؛ (سوانح عمری): لوحِ حیات؛ (مضامین وتبصرے): عصری تحریریں، عصری شعور، عصری تقاضے، عصری تناظر، عصری نقوش، ادبی مباحثے، جموں وکشمیر کا عصری ادب، عصری زاویے، عصری رجحانات، عصری تخلیقات؛ (تحقیق): اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار، کرشن چندر-میری نظر میں (ناول): اپنا اپنا سچ، آزادی، سیندور کی سوگندھ

مقالہ Genesis of Kashmir Problem & Article 370:(for ndc)

خصوصی نمبر: 'انتساب عالمی'، سرونج (دیپک بُدکی نمبر)، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۶ء

گوشے : 'شاعر ممبئی' ستمبر ۲۰۰۴ء، 'انتساب' سرونج ۲۰۰۶ء، 'اسباق' پونے جولائی ۲۰۰۷ء، سہ ماہی 'عالمی میراث' پونے ۲۰۲۰ء

انعامات : راشٹریہ گورو سمان (انٹرنیشنل فرینڈشپ سوسائٹی) ۲۰۰۹ء؛ ڈاکٹر منظر کاظمی ایوارڈ برائے فکشن ۲۰۱۹ (چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی)

ISBN 93-6058-558-0

ایم آر پبلی کیشنز

M. R. Publications

Printers, Publishers, Suppliers & Distributors of Literary Books

10 Metropole Market, 2724-25 First Floor

Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002

Cell: 09810784549, 09873156910 E-mail: abdus26@hotmail.com